

مشہور مغربی مصنفین کے قلم کے شاہکار ڈراؤنے افسانے

مترجم۔ مقبول جہانگیر (مرحوم)

آسیبی مکان

(مقبول جہانگیر)

یہ فروری ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے۔میرے والدین پیٹ اور لیلا مرفی کو اقتصادی مشکلات کا سامنا تھا۔ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔نو بیاہتا جوڑے کو مکان کے حصول میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔آخر انہوں نے دو اور نو بیاہتا جوڑوں کے تعاون سے ایک مکان کرائے پر لیا۔جس میں ہر جوڑے کے لئے صرف ایک کمرہ تھا، کئی ہفتوں کی تگ ودو کے بعد سنتا انا کیلاف کے نواح میں وہ ایک ایسا مکان تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے جس میں سات کمرے تھے اور کرایہ بھی بہت کم تھا۔یہ مکان ایک سڑک کے اختتام پر کھیتوں کے بیچوں بیچ واقع تھا۔اور عقب میں خوش رنگ درختوں کے جھنڈ تھے۔تین منزلہ مکان سورج کی روشنی میں دور سے چمکتا دکھائی دیتا۔

تینو جوڑے خوشی خوشی نئے مکان میں منتقل ہوئے۔پہلی منزل میں سامان رکھا، کلاڈ اور کیتھرائن نیلسن نے سامنے کے رخ والی خواب گاہ پسند کی، ڈک اور نورا چیپ مین نے دوسری منزل پر ایک وسیع و عریض کمرے کو خواب گاہ بنایا اور میرے والدین کے حصے میں وسیع ہال کے سرے کا کمرہ آیا۔مکان چونکہ بہت بڑا تھا اس لئے تیسری منزل کو بند رکھنے کا فیصلہ کیا گیا، تاکہ گرمی سے بچاؤ بھی رہے اور سامان بھی زیادہ بکھرنے نہ پائے، سامان کو ترتیب دینے اور مکان کی آرائش میں زیادہ وقت نہ لگا، کیونکہ مکان پہلے ہی سے خوب سجا ہوا تھا۔

گھر کی تزئین و آرائش، شاندار باغیچہ، سنگِ مرمر کے چبوترے مالکوں

کے تمول کی شہادت دے رہے تھے۔ نوجوان جوڑے حیران تھے کہ مالکوں نے اس قدر شاندار مکان چھوڑنا کیسے گوارا کرلیا۔ امی کو پرانی چیزیں جمع کرنے کا جنون تھا اور اس مکان میں پرانی چیزوں کا خزانہ دیکھ کر ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ سامنے کی خواب گاہ میں شاندار ٹائلوں کی مخروطی انگیٹھی تھی۔ یہ کمرہ بیضوی تھا۔ چھت گنبد دار، جس کے وسط میں خوب صورت زنجیروں کے ساتھ مورتیاں لٹک رہی تھیں۔ خوب صورت بالکونی نے مکان کا حسن دوبالا کر دیا تھا۔

انہیں اس مکان میں آئے چند دن گزرے تھے۔ کیتھرائن، نورا اور امی سیڑھیوں کے دروازے پر رنگ کر رہی تھیں کہ انہوں نے بل کھاتی ہوئی آہنی سیڑھیوں پر کسی کے دوڑنے کی آواز سُنی وہ تینوں یک لخت مڑیں، پوری سیڑھیاں ان کی سامنے تھیں، تاہم پیروں کی چاپ کے باوجود سیڑھیوں پر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس رات جب انہوں نے اس کا ذکر مردوں سے کیا تو ان کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی اور معاملہ ختم ہوگیا۔

کئی روز بعد رات کو جب گھر کے لوگ گہری نیند سو رہے تھے، کیتھرائن کی خوف ناک چیخ نے انہیں جگا دیا۔ وہ پکار رہی تھی۔

"کوئی میرا گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے بچاؤ، میں اٹھ نہیں سکتی"

سب اس کی خواب گاہ میں جا گھسے، وہ کسی نادیدہ طاقت سے الجھی ہوئی تھی اور وحشیانہ انداز میں ہاتھوں کو ہوا میں لہرا رہی تھی، جیسے ہوا سے لڑ رہی ہو، اس کے خاوند کا چہرہ خوف سے زرد ہوگیا تھا۔ وہ کیتھرائن کو بستر سے اٹھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ نادیدہ طاقت نے زور کے دھکے سے کیتھرائن کو فرش پر گرا دیا۔ اس کے ٹخنے پر موچ آگئی اور سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ کلاڈ اور کیتھرائن تو اسی دن مکان چھوڑ دینا چاہتے تھے، مگر انہیں دوسروں کے اصرار پر اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔

کیتھرائن کے علاج کے لئے جس ڈاکٹر کو بلایا گیا، وہ اس علاقے کا پرانا

باشندہ تھا اور مکان کے مالکوں سے اچھی طرح واقف...... جب اس سے رات کے واقعے کا ذکر کیا گیا تو وہ بڑبڑایا۔

"عجیب بات ہے، یہ مکان..........."، پھر ایک دم خاموش ہو گیا اور اصرار کے باوجود مزید کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔

چند دن بعد پھر سیڑھیوں پر کسی کے اوپر جانے کی چاپ سنائی دی، جو سیڑھیوں کے سرے پر چند لمحوں کے لئے رک گئی اور جب دوبارہ سنائی دی تو غسل خانے کا دروازہ زور سے بند ہوا اور پانی سلفچی میں گرنے لگا۔ میرے ابا سیڑھیوں کی طرف لپکے اور غسل خانے میں جا پہنچے۔ وہاں کوئی نہ تھا، لیکن پانی پوری تیزی سے گر رہا تھا۔ ابا نے اسے بند کر دیا اور واپس آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ کسی کے اوپر جانے کی آواز سنائی دی۔ ابا اس کے تعاقب میں دوڑے سیڑھیوں کے اوپر جا کر آواز کچھ دیر کے لئے بند ہو گئی۔ پھر آہستہ آہستہ غسل خانے کی طرف بڑھی۔ پھر ان کو دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ لیکن دروازے میں قطعاً کوئی جنبش نہ ہوئی تھی۔ سلفچی اور نہانے کے ٹب میں پانی گرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ پانی بالکل بند تھا۔

شام کو جب گھر کے لوگ کھانے کی میز پر جمع ہوئے تو سیڑھیوں سے کسی کی اترنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سامنے ہال کی طرف دوڑے، ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکل گیا، حالانکہ کلاڈ نے اس دروازے میں تالا لگا رکھا تھا۔

کلاڈ کو شک ہوا کہ کوئی اوپر ہے۔ وہ اطمینان کرنے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا کہ اچانک بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی۔ کوئی نیچے آ رہا تھا۔ وہ غیر محسوس طور پر کلاڈ کے پاس سے گزر گیا۔ اور ٹھنڈے سانس کی ہوا کلاڈ سے ٹکرائی۔ اس کی بعد ساری سیڑھیوں پر ایسی بدبو پھیل گئی، جس سے متلی آنے لگتی تھی۔ یہ سرانڈ

کئی روز تک پھیلی رہی۔

وہ ان واقعات کے بعد مکان چھوڑ دیتے، لیکن کرایہ بہت کم تھا اور اب تک اس خیال سے رکے ہوئے تھے کہ یہ محض واہمہ ہے، لیکن اس روز انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر دوبارہ کوئی واقعہ رونما ہوا تو وہ مکان چھوڑ دیں گے۔ ایک رات جب وہ گہری نیند سو رہے تھے، چھکڑے کی کھڑکھڑاہٹ سے جاگ اٹھے۔ گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی اور چھکڑے کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سے مل کر عجیب ارتعاش آمیز شور پیدا ہو رہا تھا۔ یہ شور آہستہ آہستہ مکان کے عقب میں جا کر ختم ہو گیا۔ پھر سرگوشیوں کی آواز آنے لگی جو بتدریج بلند ہوتی گئی، لیکن کوئی لفظ سمجھ نہیں آیا۔ ایک نیا شور پیدا ہوا اور بھاری شہتیر چھکڑے سے اتارے جانے لگے۔ جوں ہی سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی، چھکڑا جیسے چل پڑا اور پھر رفتہ رفتہ اس کی کھڑکھڑاہٹ فضا میں تحلیل ہو گئی اس کے بعد ہفتے میں دوبار ایسا ہونے لگا اور یہ معمول بن گیا۔

کئی ہفتے بعد اچانک ایک نئی افتاد پیش آئی، مکان کے عقب میں ایک پرانی اور زنگ آلود پون چکی عرصے سے مقفل پڑی تھی۔ ایک روز طلوع سحر سے پہلے پون چکی کی چوٹی پر شور پیدا ہوا۔ پھر کسی چیز کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ دیکھنے والے کو کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن کوئی چیز تھی جو پون چکی کے پتھروں سے رگڑ کھاتی ہوئی غڑاپ کی آواز سے نیچے گری تھی۔ ابا نے جب اس واقعے کا ذکر شہر میں کیا تو انہیں بتایا گیا کہ کئی سال پہلے ایک مزدور پون چکی سے گر کر مر گیا تھا، اس وقت تیز جھکڑ چل رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا، وہ مکان میں ہونے والے شور و شغب کے عادی ہوتے گئے، ایک صبح انہیں ایک نئے حادثے سے دوچار ہونا پڑا۔ ڈک، تہ خانے سے میوے کا مرتبان لینے گیا۔ اس نے ایک چھوٹے بکس پر کھڑے ہو کر اونچے طاق

سے مرتبان لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک زمین حرکت کرتی محسوس ہوئی، اس نے اسے معمولی زلزلہ قرار دیا اور مستعد ہو گیا۔ مگر زلزلے میں شدت پیدا ہوتی گئی اور وہ ایک دھچکے سے سر کی بل گر پڑا، جھٹکا رکا تو تاریک کمرے کے ایک کونے سے گہری آہ سنائی دی، جیسے کوئی دیو سانس لے رہا ہو، ڈک مرتبان اٹھا کر واپس ہوا، وہ دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ آہ اور شور دوبارہ سنائی دیا۔ جو غصے اور اضطراب سے بلند ہوتا جا رہا تھا۔ دروازہ بند ہونے کے ساتھ شور بھی رک گیا۔ میرے ابا اور کلاڈ نے اسے ڈک کے اعصابی تشنج کا کرشمہ قرار دیا۔ وہ دونوں تہہ خانے میں اتر گئے اور شور دوبارہ بلند ہونے لگا۔ انہیں ڈک کی زبان پر یقین کرتے ہی بنی۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شور ان کا تعاقب کرتا رہا اور اس وقت تھا، جب باورچی خانے کا دروازہ بند ہو گیا۔

امی نے مذاقاً کہا، تہہ خانے میں ایک عجیب الخلقت مخلوق ہے، جس کا آدھا دھڑ انسان کا اور آدھا بیل کا ہے، مگر اس پر کوئی نہ ہنسا بلکہ سب سنجیدہ ہو گئے، کلاڈ نے بازار سے مضبوط چٹخنی لا کر تہہ خانے کا دروازہ بالکل ہی بند کر دیا۔

ایک دن بعد دوپہر امی، کیتھرائن اور نورا تیسری منزل کو جانے والی سیڑھیوں پر چڑھیں۔ ان کے سامنے کچھ فاصلے پر آگ کا الاؤ روشن تھا۔ تیسری منزل کی برساتی ایک خوبصورت منظر پیش کر رہی تھی۔ وہ دروازے کھلے چھوڑ کر اوپر چھت پر چلی گئیں۔ چند لمحے بعد الاؤ سرد پڑ گیا اور دروازہ جھٹکے کے ساتھ بند ہو گیا۔ جسے وہ اپنی کوشش کے باوجود کھول نہ سکیں۔ کئی گھنٹے بعد جب رات کی سائے گہرے ہونے لگے اور ان کے خاوند گھر لوٹے تو انہوں نے اپنی بیویوں کو باہر نکالا۔ دیکھ بھال سے معلوم ہوا کہ دروازہ کسی نے بند کیا تھا۔ چٹخنی لگی تھی اور اسے مزید احتیاط کے لئے دبا دیا گیا تھا۔

کچھ روز بعد امی کے دادا، دادی مسٹر اور بیگم کلوس ملنے کے لئے آئے۔ دادی اماں ٹھگنے قد کی خاتون تھیں، لیکن بلا کا مضبوط ارادہ رکھتی تھیں۔ ان کا تعلق ایسے خاندان سے تھا، جس کے تمام افراد روحانیت کے عامل تھے۔ مگر دادا ابا ایسی چیزوں کو روحانی قرار دیتے تھے۔ خشک سالی میں لوگ دادی اماں کی خدمت میں حاضر ہوتے، ان سے مدد چاہتے، وہ کسی تالاب کے کنارے خاموش جا بیٹھتیں اور اپنی توجہ آسمان پر مرتکز کر دیتیں، تھوڑی ہی دیر میں بارش ہونے لگتی، وہ اپنی قوتِ ارادی سے بے جان چیزوں کو کمرے میں گھومنے لڑھکنے اور ناچنے پر مجبور کر دیتیں۔

ایک دن دادا عین اس وقت گھر پہنچے جب دادی اماں ایک کرسی کو کمرے میں گھما رہی تھیں۔ اور خود اپنے ڈھائی سو پونڈ وزن کے ساتھ اطمینان سے اس پر براجمان تھیں۔ دادا ابا نے شور مچانا اور لڑنا شروع کر دیا اور اس وقت تک خاموش نہ ہوئے، جب تک دادی اماں نے ان حرکتوں کو ترک کر دینے کا وعدہ نہ کر لیا۔ لیکن اس گھر کے عجیب و غریب ماحول میں ان کا وعدہ ٹوٹ گیا۔ ایک دن جب سارے لوگ بڑے کمرے کے خوب صورت آتش دان کے گرد جمع تھے، دادی اماں نے کہا۔

''اس کمرے میں ہمارے علاوہ کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں''

آتش دان کے اوپر سنہرے بالوں والی ایک خاتون کی تصویر لٹک رہی تھی،

اس کے خدو خال دلکش اور رنگ حسین تھا، بال خوب صورت انداز میں شانوں پر بکھرے ہوئے تھے ''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس خاتون کی موت طبعی نہیں تھی۔ اسے آہستہ آہستہ زہر دے کر مارا گیا، مگر لوگوں نے اسے طبعی موت جانا''

دادا ابا ایک دم چونکے، ان کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ دادی اماں کو وعدہ یاد دلا رہے ہیں۔ دادی یہ دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔ دوسری صبح امی نے دادی سے کہا کہ وہ مزید کچھ بتائیں۔ دادا شہر گئے ہوئے تھے، نورا اور کیتھرائن بھی گھر

پر نہ تھیں، دادی نے وعدہ کرلیا اور بتایا کہ انہیں کچھ دیر کے لئے اس کمرے میں تنہا رہنا پڑے گا، تب وہ کچھ بتانے کے قابل ہوسکیں گی۔ وہ اندر چلی گئیں اور امی ہال کے باہر بیٹھ گئیں۔ ابتدا میں کچھ دیر کی لئے مکمل سکوت رہا پھر ایسی آواز سنائی دینے لگی، جیسے گندم کے پتے ہوا میں اڑ رہے ہوں، یہ شور بتدریج اونچا اور کئی آوازوں میں بدلتا چلا گیا۔ امی نے گھبرا کر ہال کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں خوفناک شور بدستور جاری تھا۔ ہوا اتنی سرد اور تیز تھی کہ رونگٹے کھڑے ہوئے جاتے تھے۔ دادی سکتے کے عالم میں ایک کرسی پر بے حس و حرکت پڑی تھیں۔ امی گھبرا کر آگے بڑھیں اور ان کی ہتھیلیاں رگڑنے لگیں کہ اچانک ابا اور دادا کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئے اور انہیں اوپر خواب گاہ میں لے گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب دادی کو ہوش آیا تو امی ان کے پہلو میں بیٹھی تھیں اور دادا وہاں نہ تھے۔ انہوں نے امی سے کہا۔ تمہیں کمرے میں داخل نہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ یہ بتانے پر رضامند ہو گئے تھے کہ انہیں کیا چاہیے؟ اور وہ کس شرط پر مکان چھوڑیں گے؟ اچانک تم کمرے میں داخل ہوگئیں۔ اس مکان میں ایک زبردست المیہ وقوع پذیر ہوا ہے۔ سنہری بالوں والی عورت کو مارا گیا ہے۔ اس گھر میں کوئی غیر انسانی اور بے رحم مخلوق ہے میں ان چیزوں سے نہیں ڈرا کرتی، مگر آج میں بھی خوفزدہ ہوں"۔

امی نے محسوس کیا کہ دادی اما کا چہرہ غیر معمولی طور پر زرد ہے، اور ان کی زبان بات کرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہے۔ دادی اس سے پہلے کبھی اتنی خوفزدہ نہیں ہوئی تھیں۔

دوسری صبح دادی نے جانے کی تیاری شروع کردی، کیونکہ رات بھر کوئی انہیں تنگ کرتا رہا تھا اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی سو نہ سکی تھیں۔ وہ ہال کمرے کی تصویر کو آخری نظر دیکھ لینے کے لئے اندر داخل ہوئیں۔

امی اس وقت باورچی خانے میں تھیں کہ اچانک دادی اماں کی چیخ سنائی دی۔ گھر پر صرف امی اور دادا ابا موجود تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ دادی کا چھوٹا سا جسم فرش پر پڑا تھا۔ وہ کسی نادیدہ دشمن سے لڑ رہی تھیں۔ ان کے ہاتھوں کی حرکت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کا گلا دبا رہی ہیں کہ اچانک وہ فرش سے اٹھیں اور لڑکھڑا کر کوچ پر گر گئیں۔ ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ دم گھٹنے لگا اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ کوئی انجانی انگلیاں ان کا گلا دبا دیں۔ دادا چیخے ''خدا کے لئے اسے بخش دو'' وہ بار بار یہی دھرا رہے تھے کہ کسی چیز نے پوری طاقت سے دادی اماں کو زمین پر دے مارا۔ دادا تیزی سے آگے بڑھے اور بیوی کو بازوؤں پر اٹھا کر باہر بھاگے۔

''ہم اب کبھی اس منحوس گھر میں نہ آئیں گے۔ اس سے پہلے کہ کوئی خطرناک حادثہ پیش آئے ہم اس مکان کو چھوڑ دو۔

امی جب دادی اماں کو الوداعی بوسہ دینے کے لئے جھکیں تو انہوں نے سرگوشی کی''

میں اس سنہری بالوں والی خاتون سے مصروف گفتگو تھی کہ میں نے اس کے پیچھے ایک خوفناک مخلوق کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ یہ قامت میں آدمی کے برابر ہے۔ مگر میں نے اس سے پہلے ایسی مخلوق کبھی نہیں دیکھی۔ اس کی نارنجی رنگ کے بال سخت کھردرے اور کھڑے ہیں اور ہاتھ اندر کی طرف مڑے ہوئے۔ یہ مخلوق خاتون کے گرد چکر کاٹتے ہوئے آئی اور میرے قریب کھڑی ہو گئی پھر کہنے لگی۔

''میں تمہیں ختم کر دوں گا'' میری گردن دیکھو، جہاں اس نے اپنے ناخن میرے گوشت میں گاڑ دیئے۔ یہ زخم بہت گہرا ہے۔ وعدہ کرو کہ تم اس مکان کو چھوڑ دو گی، کیونکہ یہ مکان بہت جلد نذر آتش ہو جائے گا اور بنیادوں کے سوا اور کوئی چیز نہ

بچے گی“۔

دادی اماں کی گردن کا زخم زندگی بھر باقی رہا اور مخلوق سے مقابلے کے بعد ان کی آواز اس قدر بیٹھ گئی تھی کہ وہ سرگوشی میں بات کرتی تھیں۔

اس پر اسرار مکان کی یہ داستان ایک رات اپنی انتہا تک پہنچ کر ختم ہوگئی، کیتھرائن اور کلاڈ اپنے کمرے میں تھے۔ کیتھرائن نے حسب معمول اپنے بال صاف کئے اور بستر پر لیٹ گئی چند لمحے بعد ایک چونکا دینے والی چیخ کے ساتھ اس نے اپنے بستر کو نوچنا شروع کر دیا۔ ڈک اور ابا ان کے کمرے کی طرف دوڑے، کلاڈ اپنے جوتوں سے بری طرح بستر پیٹ رہا تھا۔ ابا نے کیتھرائن کے پاؤں پر پڑے ہوئے بستر کے کمبل کو پلٹ دیا۔ ایک بہت بڑی چمگادڑ کیتھرائن کے پاؤں سے چمٹی ہوئی تھی۔ ابا نے اسے چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ آخر ڈک کے جوتے کی ایک زبردست ٹھوکر کے ساتھ چمگادڑ فرش پر آ رہی۔ فرش پر گرتے ہوئے وہ اڑی اور کمرے کے ایک شیشے کو توڑتی ہوئی باہر تاریکی میں گم ہوگئی۔

اگلی صبح انہوں نے یہ مکان چھوڑ دیا۔ وہ سب الگ الگ ہوگئے۔ مکان اسی طرح آراستہ تھا۔ ابا نے صرف گلاب کے چند گملے اور ایک کتاب وہاں سے اٹھائی اور آج یہی دو چیزیں اس مکان کی یادگار ہیں۔ کیونکہ ان کے چھوڑنے کے چند دن بعد مکان کو اچانک آگ لگ گئی اور بنیادوں کے سوا سب کچھ جل کر راکھ ہوگیا۔

دادی اماں کی موت کے بعد کئی سال تک کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ قریب قریب سب یہ واقعہ بھول گئے اور ہم اس پر اسرار مکان کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے کہ ایک دن جم چچا اچانک سیڑھیوں سے لڑھک گئے۔ ان کا چہرہ سفید ہوگیا تھا اور وہ کانپ رہے تھے۔ اسٹور میں کوئی چیز ہے۔ اس کے بال نارنجی اور کھڑے ہیں۔ اس نے مجھے دروازے سے جھانک کر دیکھا پھر دروازہ بند کر لیا۔ اس پر یقین

کرو، نہ کرو، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے“۔

وہ بڑبڑا رہے تھے۔ان کے حواس بجا ہوئے تو ہم ان کا مذاق اڑانے لگے، مگر وہ نہایت سنجیدہ تھے۔انہوں نے ہمیں اس مکان کی کہانی سنائی اور دادی اماں کی موت کا واقعہ بھی اس کے بعد وہ اکثر گھر میں کسی ”پراسرار شے“ کی موجودگی کی شکایت کرتے ،مگر ہم ہنسی مذاق میں ڈال دیتے، آخر ایک دن چچا جم اپنی چارپائی پر مردہ پائے گئے۔

۱۹۴۸ء میں میرے والدین سان برنارڈینو کے اس مکان میں اٹھ آئے جہاں چچا جم کی موت واقع ہوئی تھی۔ یہ مکان دادی اماں نے بنوایا تھا۔میرا بیٹا مائیک ان کے ساتھ تھا۔امی نے اپنے لئے دوسری منزل کے تین کمروں میں سے درمیانہ کمرہ منتخب کیا اور ابا نے اس کے ساتھ کا کمرہ لے لیا۔مائیک امی کی ساتھ تھا۔ یہاں ان کی پہلی رات تھی۔امی تین بجے تک نہایت پرسکون نیند سوئی رہیں کہ کسی کے قدموں کی چاپ نے انہیں جگا دیا۔کمرے میں کوئی چل پھر رہا تھا۔سامنے ایک سایہ دکھائی دیا۔انہوں نے آواز دی، خیال تھا کہ ابا اپنی کم خوابی کی شکایت کی وجہ سے سو نہیں سکے۔سایہ تیزی سے بستر کی طرف پلٹا اور قریب پہنچ کر انہیں گھورنے لگا۔ماں کا کہنا ہے کہ چہرہ قطعاً غیر انسانی تھا۔اس نے اپنا بدہیئت ہاتھ مائیک کی طرف بڑھایا، جو ابھی تک سو رہا تھا۔امی نے خوفزدہ ہو کر بستر سے نکلنے کی کوشش کی،مگر اس نے انہیں واپس دھکیل دیا، امی نے اس کے چہرے پر ایک بھرپور نظر دوڑائی، گہرے زرد اور خوفناک دانت آگے کو نکلے ہوئے تھے اور آنکھیں گومڑوں میں چھپی تھیں۔مائیک کو تاڑتے ہوئے اس نے دوبارہ بستر تک پہنچنے کی کوشش کی، لیکن امی اس کے راستے میں حائل ہو گئیں۔امی کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے وہ مائیک کی طرف لپکا، جواب جاگ چکا تھا،لیکن اس سے پہلے کہ وہ مائیک تک پہنچے امی

جھپٹیں اور اس کے بالوں کو نوچ لیا۔

کھڑکی سے چھن کر آنے والی چاندنی میں انہوں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ اندر کو مڑے ہوئے ہیں۔ وہ مائیک تک پہنچ رہے تھے۔ مائیک اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور چیخنے لگا۔ امی نے ایک ہاتھ سے اس پراسرار مخلوق کے مکروہ چہرے پر دھڑا دھڑ مکوں کی بارش کر دی اور بالوں سے کھینچتے ہوئے بستر سے دور لے گئیں۔ وہ ابا کو آوازیں دے رہی تھیں۔

اچانک امی کے سر پر ایک زبردست چوٹ پڑی وہ لڑکھڑا گئیں اور پراسرار مخلوق دوبارہ بستر کی طرف پلٹی۔ امی نے چھلانگ لگائی اور اس کے سامنے آ گئیں۔ مائیک تک پہنچنے کے جنون میں اس نے بستر کو اپنی طرف کھینچا، لیکن اس کے بال پھر امی کے ہاتھ میں آ گئے۔ انہوں نے بالوں کو نوچتے ہوئے اس کے پیٹ پر ایک زبردست ضرب لگائی اور وہ ڈگمگا گیا۔ مائیک بے تحاشا چلا رہا تھا......

"دادا، دادا، جلدی کرو"

ابا نے اپنے کمرے کی بتی جلائی اور تیزی سے دوڑے، چند لمحے انہیں کچھ سجھائی نہ دیا۔ وہ اسے بستر سے پرے ہٹتے ہوئے نہ دیکھ سکے اور پراسرار مخلوق برساتی کے کھلے دروازے کی طرف بڑھی۔ ابا کی موجودگی سے امی کا حوصلہ بلند ہو گیا تھا۔ وہ اس کے پیچھے دوڑیں، وہ مخلوق اچانک پلٹی، اور انتہائی غصے میں اس نے مائیک کی طرف اشارہ کیا۔ امی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، مائیک بخیریت تھا جب انہوں نے دوبارہ برساتی کی طرف دیکھا تو وہ دور نکل گئی تھی۔ چاندنی میں امی نے دیکھا کہ اس نے ایک عجیب لباس پہنا ہوا تھا، جو ہلکے رنگ کے تنگ سے چغے پر مشتمل گھٹنوں اور کہنیوں تک لمبا تھا، ننگے بازوؤں پر لمبے بال تھے۔ سر کے نارنجی بال سوئیوں کی طرح کھڑے تھے اور ناک کے بال نتھنوں سے باہر نکل آئے تھے۔ ابا نے امی کے

اشارے پر برساتی کی طرف دیکھا۔صحن سے ۲۰ فیٹ کی بلندی پر اس کمرے میں سوائے سونے کے کمرے کے کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔لیکن انہیں کوئی چیز دکھائی نہ دی۔تاہم ایک متعفن گوشت کی بو سارے کمرے میں پھیل چکی تھی۔

اس حادثے کے بعد ابا کے سوا کسی کو بھی اس کمرے میں سونے کی جرات نہ ہوئی۔وہ اس پراسرار مخلوق کی واپسی کے منتظر تھے۔لیکن وہ کبھی نہ آئی ۱۹۵۲ء میں ہم نے یہ مکان بیچ دیا،لیکن آج تک میں ں واقعی پر حیران ہوں اور سوچتا ہوں کہ کیا اَن جانی قوتیں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاسکتی ہیں؟ کیا ان کی دشمنی نسل در نسل چلتی ہے؟

☆☆☆

Please press "Next' to read next story

انسانی بھیڑیا

(مقبول جہانگیر)

مارچ ۱۸۴۸ء کی ایک سرد اور دھندلی دھندلی سی صبح کا ذکر ہے کہ جنرل ڈیری مَن پیرس کے سب سے بڑی قبرستان پیری لاشیز کے صدر دروازے پر گھوڑے سے اُترا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ تاہم جنرل کو بارش کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس کے چہرے پر غم واندوہ کے آثار گہرے تھے اور جب وہ گھوڑے سے اُتر کر دروازے کی طرف بڑھا تو اس کی کمر جھکی ہوئی اور چال میں لغزش کا اظہار نمایاں تھا وہ دراصل اپنی کم سن بیٹی کی قبر دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ جسے گزشتہ روز شام کو دفنایا گیا تھا لیکن شدید بارش اور حد سے زیادہ تاریکی کے باعث گورکن نے قبر کو پتھر کی سلوں سے ڈھانپنے کا کام اگلے دن پر ملتوی کر دیا تھا۔ جنرل ڈیری من اب اپنی بچی کی صورت آخری دفعہ دیکھنے کے ارادے سے آیا تھا۔

قبرستان کے منتظم کا سلام لیتا ہوا وہ آہستہ آہستہ اس حصے کی طرف بڑھا جہاں بچی کی قبر تھی۔ جوں ہی وہ قبر کے نزدیک گیا، اسے ایسا نظر آیا جیسے کوئی جانور یا آدمی اس کے قدموں کی آہٹ پا کر قبر میں سے نکلا اور اچھل کر ایک طرف بھاگ گیا۔ جنرل ٹھٹھک کر وہیں رک گیا اور غور کرنے لگا کہ یہ کیا چیز تھی۔ کوئی آدمی؟ کتا؟ بھیڑیا؟ یا کوئی بھوت پریت؟ یہ وہ سوال تھا جو بعد ازاں مہینوں تک نہ صرف فرانس، بلکہ یورپ کے تمام ملکوں میں لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے پھرے لیکن مارچ ۱۸۴۸ء کی اس دھندلی صبح کو جنرل ڈیری من نے چند ثانیے تک غور کیا اور پھر اسے اپنی نظر کا فریب قرار دے کر قبر

کے قریب پہنچ گیا۔

جب اُس نے قبر کو دیکھا تو دہشت سے وہ لڑکھڑایا اور ضبط کے باوجود اس کے منہ سے دبی سی چیخ نکل گئی۔ تابوت کا ڈھکنا ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ بچی کا اُدھڑا اور نچا ہوا کفن بھی مٹی کے اوپر دھجیوں کی صورت میں رکھا تھا اور لاش کے اعضاء الگ الگ ہو چکے تھے۔ اس کا پیٹ چاک کر کے آنتیں نکال لی گئی تھیں اور رانوں پر دانتوں کے سے نشانات نمایاں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی جانور نے لاش کو قبر سے نکال کر ہڑپ کرنے کی کوشش کی ہے۔

جنرل ڈیری من کے لئے یہ نظارہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ وہیں غش کھا کر گر پڑا اور تھوڑی دیر بعد قبرستان کے ایک چوکیدار نے جو اپنے کتوں کے ساتھ گشت کرتا ہوا اُدھر آ نکلا تھا، بدنصیب جنرل کو قبر کے اوپر بے ہوش پڑے پایا۔ اسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ جہاں وہ ہفتوں زیرِ علاج رہا لیکن اس حادثے کا اثر اس کی ذہن پر ایسا ہوا کہ وہ ذہنی طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ناکارہ ہو گیا۔

یہ حادثہ کوئی معمولی نہ تھا اور یہ واقعہ ہے کہ اس نے آگے چل کر براعظم یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ پہلے پہل یہ خیال کیا گیا کہ یہ کارستانی کسی کتے یا بھیڑیے کی ہے، کیونکہ پیرس کے گردونواح میں ان دنوں بھیڑیے اکثر دیکھے جاتے تھے اور انہوں نے بعض اوقات قبریں کھود کر لاشیں بھی نکالی تھیں، لیکن جب پولیس کے سراغ رسانوں نے قبرستان کا معائنہ کیا تو بچی کی قبر کے گرد نرم اور چکنی مٹی میں بھیڑیے کے نہیں، انسانی قدموں کے نشانات پائے گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ اگر یہ کام کسی آدمی کا ہے تو وہ قبرستان میں کیسے داخل ہوا اور پھر باہر کس راستے سے گیا۔ کیونکہ اس وسیع و عریض قبرستان کے گرد تقریباً دس فیٹ

اونچی دیوار کھنچی ہوئی تھی، اس کے آہنی دروازوں کو ہمیشہ مقفل رکھا جاتا تھا اور ان دروازوں پر ہمیشہ چوکیدار اپنے کتوں کے ساتھ موجود رہتے تھے۔ ایک لمحے کے لئے فرض کر لیجئے کہ کوئی شخص قبرستان میں کسی طرح داخل بھی ہو گیا تو یہ بات کسی طرح قابل یقین نہ تھی کہ وہ قبر سے معصوم بچی کی لاش نکال کر اس کی یوں بے حرمتی کرے گا اور اسے ہڑپ کرنا چاہے گا۔ یہ کام تو لازماً کسی وحشی جانور یا درندے ہی کا ہو سکتا ہے۔

پیرس کے لوگ ابھی اس المناک حادثے پر قیاس کے گھوڑے دوڑا ہی رہے تھے کہ اسی پیری لاشِز کے قبرستان میں ایک اور قبر کھود کر ادھیڑ عمر عورت کی لاش نکالی گئی اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، پھر چند دن کے اندر اندر پیرس کے دوسرے قبرستانوں سے بھی اسی طرح کی خبریں آنے لگیں اور شہر میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سرکاری اور عوامی حلقے خوف زدہ بھی تھے اور پریشان بھی...... ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ شہر کے جنوبی رُخ پر واقع قبرستان میں بارہ سالہ لڑکی کی لاش قبر سے باہر پڑی پائی گئی۔ اس کی انتڑیاں اور کلیجہ بھی نکال لیا گیا تھا۔ اسی طرح مونٹ پرناس کے قبرستان میں بھی یکے بعد دیگرے ایسی وارداتیں ہوئیں۔ ۴۸ سال کی ایک عورت، جسے آٹھ روز قبل دفن کیا گیا تھا، اپنی قبر سے باہر پڑی پائی گئی، لاش کے بازو اور پاؤں الگ الگ کر دیئے گئے تھے۔ ان تمام لاشوں کے معائنے سے ظاہر ہوا کہ ان پر ایک ہی جیسے دانتوں کے نشانات ہیں، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس درندگی کا ذمے دار صرف ایک ہی جانور یا انسان ہے۔

اسی دوران میں پولیس نے ایک اور بات دریافت کی لاشوں کے جو اعضاء الگ الگ کئے گئے تھے۔ ان کے معائنہ سے علم ہوا کہ انہیں چھری

چاقو سے کاٹا نہیں گیا، بلکہ یہ کسی مضبوط بازوؤں کی قوت سے اکھاڑے گئے ہیں اور ان بازوؤں کے ہاتھوں کی ناخن بھی نہایت نوکیلے اور لمبے ہیں۔ ان ہاتھوں اور ناخنوں کے نشانات مٹی میں بھی دیکھے گئے۔ ان دنوں قبریں زیادہ گہری نہیں کھودی جاتی تھیں۔ اور تابوت صرف دو یا ڈھائی فیٹ کی گہرائی ہی میں رکھ کر قبر بند کر دی جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی قبر کو کھودنا کسی انسان یا درندے کے لئے کچھ زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ انسان یا درندہ تازہ قبروں پر حملہ کرتا تھا۔ جن کے تابوت آسانی سے نکال کر کھولے جاسکتے تھے۔ لکڑی کے یہ تابوت کچھ زیادہ مضبوط بھی نہ ہوتے تھے۔ تابوتوں کے ڈھکنوں پر خون کے نشانات بھی دیکھے گئے جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ خون اکھاڑنے والے کے ہاتھوں سے اس وقت گرتا ہے جب وہ تابوت کے ڈھکنے سے زور آزمائی کرتا ہے اور اپنے ہاتھ کیلوں سے زخمی کر لیتا ہے۔

قبرستانوں کے چوکیداروں کی تعداد دگنی اور پھر دوگنی اور پھر تگنی کر دی گئی، ان کو اسلحہ دیا گیا اور اجازت تھی کہ وہ ممنوع اوقات میں جس شخص کو بھی قبرستان میں گھومتا پھرتا دیکھیں۔ بے دریغ گولی مار دیں۔ اس کے علاوہ خون خوار کتے بھی قبرستانوں میں چھوڑے گئے جن کی سننے اور سونگھنے کی حس بڑی تیز تھی اور جو خطرناک سے خطرناک مجرم کا اندھیرے میں تعاقب کر کے اسے پکڑ لیتے تھے۔ قبرستانوں کے اندر جابجا راستوں اور قبروں کے درمیان ''سپرنگ بندوقیں'' لگائی گئیں اور ان کی لبلبیوں سے لوہے کے سیاہ تار اس طرح باندھے گئے کہ جوں ہی کوئی جانور یا انسان ان تاروں سے گزرے، یہ بندوقیں خود بخود فائر کریں۔ لیکن ان تمام انتظامات اور کڑی نگرانی کے باوجود لاشوں کی بے حرمتی اسی طرح ہوتی رہی اور روزانہ کسی نہ کسی قبرستان سے قبریں کھدنے اور

لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی خبریں آتی رہیں۔

پانچ نومبر ۱۸۴۸ء کی رات کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا ہسپتال کے قبرستان میں جہاں لاوارثوں اور محتاجوں کو مرنے کے بعد دفنایا جاتا تھا۔ کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا اور پھر یک لخت وہ سب کی سب ایک طرف دوڑتے ہوئے گئے۔ غالباً انہوں نے کسی شے کو قبروں کے درمیان حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ چند منٹ بعد ہی کتے واپس چوکیداروں کے پاس آگئے، لیکن اس عالم میں کہ ان کی دمیں ٹانگوں میں دبی ہوئی اور سر جھکے ہوئے تھے اور ان کی حالت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کتوں پر خوف طاری ہے۔ چوکیداروں کی ہمت نہ ہوئی کہ وہ رات کے وقت قبرستان میں گھوم پھر کر تحقیق کرتے، البتہ صبح ہوتے ہی انہیں ایک عورت کی نچی ہوئی لاش قبر کے باہر پڑی دکھائی دی۔ اس عورت کی لاش ایک کھلی قبر سے نکالی گئی تھی۔ قاعدہ یہ تھا کہ جتنے بھی محتاج اور لاوارث افراد مر جاتے تھے، انہیں ایک ہی قبر میں ڈال دیا جاتا تھا اور جب تک قبر لاشوں سے پُر نہ ہو جاتی۔ اس وقت تک اسے بند نہیں کیا جاتا تھا۔ لاش کی بائیں ران پر ان دیکھی بلا کے ناخنوں کے نشانات نمایاں تھے۔ یہ بات سب کو حیران اور خوف زدہ کیے ہوئے تھی کہ کتوں نے آخر اس بلا پر حملہ کیوں نہیں کیا اور وہ واپس کیوں آگئے۔

شہر بھر میں اس کا چرچا ہونے لگا اور عجیب عجیب خیالات اور افواہیں گردش کرنے لگیں ابھی اس معمے کو حل کرنے کی فکر میں تھے کہ اگلی رات ایک اور اس سے بھی عجیب خبر سننے میں آئی۔ قبرستان کے چوکیدار نے حلفیہ بیان دیا کہ وہ رات کو قبرستان کی نگرانی کر رہا تھا کہ اس نے ایک انسانی سایہ اندر سے

نکلتے ہوئے دیکھا۔ چوکیدار نے اپنے اوسان بحال رکھے اور پستول سے اس سائے پر فائر کیا۔ اس کے الفاظ ہیں۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میرا نشانہ ہرگز خطا نہیں گیا۔ لیکن میں نے جس انسانی سایہ کا پیچھا کیا تھا وہ کوئی بلا ہی تھی۔ کیوں کہ چشم زدن میں وہ قبرستان کی اونچی دیوار پر چڑھ کر نظروں سے غائب ہوگئی''

چوکیدار کو جب اطمینان ہوگیا کہ وہ بلا قبرستان سے نکل گئی تو وہ اپنی لالٹین اٹھا کر اس قبر کی طرف گیا اور اس کے اندر روشنی پھینکی، اسے چار لاشیں پڑی نظر آئیں۔ یہ دو آدمیوں اور دو عورتوں کی لاشیں تھیں۔ ان لاشوں کو دیکھ کر چوکیدار چیختا ہوا واپس بھاگا اور دوسرے چوکیداروں کو قصہ سنایا، لیکن وہ سب اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ کسی نے دوبارہ قبر کے پاس جانے کی جرات نہ کی اور صبح ہوتے ہی انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس والے جب قبر کے پاس پہنچے تو ایک اور حیران کن انکشاف ہوا، لاشیں اب چار کے بجائے پانچ ہوچکی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ بلا رات کو پھر کسی وقت قبرستان میں داخل ہوئی اور اس نے ایک اور لاش کو چیرا پھاڑا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے اس لاش کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ اس کی انتڑیوں کو چبایا اور جسم کے بعض حصوں کا گوشت کھایا بھی گیا ہے۔

پیرس والے ابھی اس صدمے سے اچھی طرح سنبھلنے بھی نہ پائے تھے

کہ مونٹ پرناس کے قبرستان میں لگی ہوئی اسپرنگ بندوقوں میں سے ایک بندوق نے آدھی رات کو خودبخود فائر کیا۔ پولیس کے سپاہیوں اور قبرستان کے چوکیداروں نے اسی وقت اس مقام کا معائنہ کیا جہاں یہ بندوق چلی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا اور نہ خون کے دھبے دکھائی دیئے۔ بندوق چلنے کی وجہ لازماً یہی

تھی کہ کسی نے چلتے ہوئے اس تار پر پیر رکھ دیا جو بندوق کی لبلبی سے بندھا ہوا تھا۔ لیکن زخمی ہونے والے کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ البتہ تین قبروں سے تین لاشیں نکال کر انہیں حسب معمول چیرا پھاڑا جا چکا تھا۔ اور کہیں سے لاشوں کا گوشت بھی غائب تھا اور ان پر یہ نشانات واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔

اس حادثے کے دو ہفتے بعد ایک قبرستان کے چوکیدار نے رات کے وقت ایک تاریک انسانی سایہ قبرستان کے پاس سرکتے دیکھا۔ اس نے بے تامل بندوق سے اس پر فائر کیا۔ لیکن بے سود...... سایہ دیکھتے ہی دیوار پر چڑھا اور غائب ہو گیا۔ صبح اس دیوار کو دیکھا گیا تو عین اسی جگہ گولی کا نشان موجود تھا جہاں انسانی سایہ کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گولی اس کے جسم سے پار ہو کر دیوار میں جا لگی تھی۔ خون کا کوئی قطرہ یا دھبا بھی وہاں دیکھا نہیں گیا۔

کئی ماہ گزر گئے۔ قبرستان میں لاشوں کا یہی حشر مسلسل ہوتا رہا۔ پولیس کے جاسوسوں نے اپنی نیندیں حرام کر لیں اور اس نادیدہ بلا کا سراغ لگانے کی سر توڑ کوشش کی مگر ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا، آہستہ آہستہ سب کی ذہن میں اس خدشے نے گھر کر لیا کہ یہ کوئی ''غول بیابانی'' یا انسانی بھیڑیا ہے جو پیرس کے قبرستانوں میں آ نکلا ہے۔ انسانی بھیڑیے کا تصور ان لوگوں کی ذہن میں بہت عرصے سے موجود تھا اور اس کے بارے میں طرح طرح کی پُر اسرار اور لرزہ خیز داستانیں ہر گھر میں دہرائی جاتی تھیں۔ یہ بات مشہور تھی کہ بعض مردود اور لعین آدمی قوی ہیکل بھیڑیے کی شکل اختیار کر سکتے ہیں اور کوئی رکاوٹ ان کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی وہ دیواروں میں سے دھوئیں کی طرح پار ہو سکتے ہیں۔ کتے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور نہ ان انسانی بھیڑیوں کو تلوار، لاٹھی یا عام بندوق کی گولی سے ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ اعتقاد تھا کہ

بندوقوں میں چاندی کی بنی ہوئی گولیاں استعمال ہوں تو یہ بھیڑیے مر سکتے ہیں ان کی موجودگی میں یہ شیطانی بلائیں قریب نہیں آسکتیں۔ چنانچہ عوام کی طرف سے حکومت پر زور دیا گیا کہ اس بلا کو مارنے کے لئے پہرے داروں اور پولیس کے سپاہیوں کو چاندی کی گولیاں مہیا کی جائیں اور قبرستانوں کے دروازوں، مختلف راستوں اور دیواروں پر ایسے پھول اور جڑی بوٹیاں لگائی جائیں کہ بلا قبرستان میں داخل نہ ہو سکے۔

واقعہ یہ تھا کہ سولہویں صدی میں بھی فرانس کے لوگوں کو کچھ ایسے ہی ''انسانی بھیڑیوں'' سے دوچار ہونا پڑا تھا اور ان کی ایسی دہشت پھیلی تھی کہ ہزاروں آدمی مر گئے تھے اور اب پھر ایسی ہی صورت حال کا سامنا تھا، تاہم حکومت نے لوگوں کی ذہن سے اس خرافات کو نکالنے کے لئے اعلان کیا کہ یہ کوئی بد روح یا بلا ہرگز نہیں ہے، بلکہ کوئی انسان ہی ہے جو دیوانگی کے باعث ایسی حرکتیں کر رہا ہے اور جلد یا بدیر اسے پکڑ لیا جائے گا۔ اگرچہ سرکاری طور پر یہی کہا جا رہا تھا، لیکن حقیقت میں خود پولیس والے اور دوسرے بڑے بڑے لوگ بھی دل میں ڈرے ہوئے تھے اور انہیں روز بروز یہ یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ان کا واسطہ گوشت پوست کے کسی انسان سے نہیں، بلکہ بد روح سے ہے۔ یہ

ایک خوبصورت اور لمبے تڑنگے نوجوان سارجنٹ فرینکو میس کو بستر پر پڑے پایا۔ اسپرنگ بندوق نے اس کا دایاں پیر بُری طرح زخمی کر دیا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔

''آہ، آخر کار آپ لوگوں نے مجھے پکڑ ہی لیا''

یہ تھا وہ انسانی بھیڑیا جس نے ایک سال سے پیرس کے لوگوں کی زندگی دوبھر کر رکھی تھی۔ یہ تھا وہ انیسویں صدی کا ''ماڈرن ویمپائر'' اور ''غول

بیابانی‘‘ جس نے قبرستانوں سے تقریباً ساٹھ ستر لاشیں نکال کر چیر پھاڑ ڈالی تھیں اور جس کے اس درندہ صفت اور شیطانی کارناموں نے سارے یورپ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ فرانس کی تاریخ کا یہ سب سے نرالہ، لیکن وحشت انگیز مقدمہ شروع ہونے سے پیشتر ماہر ڈاکٹروں کی ایک جماعت نے نوجوان فرینکو میس کا اچھی طرح معائنہ کیا اور اس کی گزشتہ زندگی کے حالات جاننے کی پوری کوشش کی۔

پولیس کی تحقیق کے مطابق فرینکو میس برٹرینڈ شمال مشرقی فرانس کے مشہور قصبے والکسے میں پیدا ہوا۔ اس کے والدین اپنے قصبے کی اچھے کھاتے پیتے لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اور ایک زرعی فارم کے مالک تھے۔ فرینکو میس کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ جو آگے چل کر دماغی عارضے میں مبتلا ہو کر مر گیا ویسے وہ ہر طرح ہوش مند تھا۔ اچھی طرح بولتا، لکھتا، پڑھتا اور روزمرہ کے تمام معمولات صحیح الدماغ لوگوں کی طرح سر انجام دیتا تھا، لیکن درحقیقت وہ ذہنی طور پر ایک بہت بڑے دماغی عارضے میں گرفتار تھا۔ اس کا واحد مشغلہ یہ تھا کہ وہ پرندوں کو کھولتے پانی میں ڈال دیتا۔ بلیوں اور کتے کے پلوں کو آگ کے جلتے تندور میں پھینک دیتا اور معصوم بچوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچا کر خوش ہوتا۔ فرینکو میس کا ایک چچا بھی ایسی ہی قبیح اور مکروہ عادتوں کا شکار تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذہنی وحشت اور بربریت اس خاندان کے افراد پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے۔

فرینکو میس کے والد نے اسے ابتداء میں لینگرز کے ایک ایسے اسکول میں داخل کرایا جہاں صرف مذہبی تعلیم دی جاتی تھی۔ فرینکو میس کا باپ اسے دراصل پادری بنانا چاہتا تھا۔ لیکن فرینکو میس پادری بننے پر تیار نہ تھا۔ اسکول

میں چند سال گزارنے کے بعد ۱۸۴۴ء میں وہ فوج میں بھرتی ہوگیا اور جلد ہی اپنی عمدہ کارکردگی، اچھے اخلاق اور ہنس مکھ طبیعت کے باعث اپنی رجمنٹ میں ہر دل عزیز ہوگیا۔ اسی زمانے میں اسے شراب کی لت پڑگئی اور وہ بے تحاشا پینے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ قحبہ خانوں اور اسی طرح کی دوسری بدنام جگہوں پر بھی آنے جانے لگا حالانکہ یہ حرکت فوجی اصولوں اور احکامات کے قطعی خلاف تھی۔ تاہم وہ یہ حرکتیں نہایت ہوشیاری اور چالاکی سے کرتا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

اس کی صحت دوسروں کے لئے قابل رشک تھی اور فوجی ڈاکٹروں کی رپورٹوں سے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی فوجی ڈیوٹی کے دوران میں کبھی بیمار نہیں پڑا۔ اپنے مناسب قد و قامت، خوب صورت نقش و نگار، نیلی آنکھوں، سنہری بالوں اور پتلی مونچھوں کے باعث وہ ہر ایک کی نظر میں جچتا تھا اور کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات حشر تک نہ آسکتی تھی کہ یہ بھولی بھالی صورت رکھنے والا فوجی جوان وہ شیطان صفت ''انسانی بھیڑیا'' ہے جس نے سترہ لاشوں کی بے حُرمتی کی ہے اور ان کا گوشت چبایا ہے۔

چونکہ اس کا تعلق فوج سے تھا، اس لئے اس پر فوجی عدالت ہی میں مقدمہ چلایا گیا۔ کرنل مینسیلن عدالت کا صدر تھا۔ فرینکو میس بیساکھیوں کے سہارے کمرہ عدالت میں جب داخل ہوا تو موت کی سی خاموشی طاری ہوگئی اور ہر شخص پلک جھپکے بغیر اس انسانی بھیڑیے کو دیکھنے لگا۔ تماشائیوں کا خیال تھا کہ چوں کہ وہ دماغی جنون میں مبتلا ہے اس لئے عدالت میں بھی وحشیانہ پن کا مظاہرہ کرے گا۔ لیکن ان کی توقع کے برعکس فرینکو میس نے عدالت کے تمام سوالوں کے جواب نہایت واضح صورت میں اور پورے اطمینان و سکون سے

دیئے۔ اس کے چہرے پر پریشانی یا گھبراہٹ کی ہلکی سی نشانی بھی کسی کو نظر نہ آئی۔

کرنل مینیسلن نے دریافت کیا۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ لاشیں قبروں سے نکال کر چیرنے پھاڑنے کا جنون کب سوار ہوا؟"

فرینکو میس نے ایک لحظہ تامل کرنے کے بعد جواب دیا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، فروری ۱۸۴۷ء کی ۲۳ یا ۲۵ تاریخ تھی جب پہلے پہل مجھ پر یہ دورہ پڑا۔ میں اپنے ایک فوجی دوست کے ساتھ سیر سپاٹے کے لئے نکلا تھا کہ ہمارا گزر بلیر کے قبرستان سے ہوا یہ قبرستان ٹورز کے نزدیک واقع ہے۔ ہم دونوں قبرستان میں چلے گئے۔ اسی روز یا غالباً ہمارے آنے سے تھوڑی دیر پیشتر کسی آدمی کی لاش دفنانے کے لئے قبرستان لائی گئی تھی اور ابھی اسے تابوت میں ڈال کر قبر کے اندر رکھا ہی جا رہا تھا کہ بارش شروع ہو گئی۔ چنانچہ گورکن تابوت کو اسی طرح چھوڑ کر چلا گیا۔

تابوت کو دیکھتے ہی مجھ پر ایک دم دورہ پڑا، میرا سر بھاری ہو گیا، دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور جی میں آیا کہ اس تابوت میں سے لاش نکال کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالوں، میں کہہ نہیں سکتا کہ میری یہ حالت کیوں ہوئی۔ میرے دوست نے میری حالت دیکھ کر کہا۔ "شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، آؤ واپس چلیں۔ وہ مجھے لے کر قبرستان سے باہر نکلا، لیکن میرا جوش دم بدم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ میں نے بہانہ کر کے اسے ایک طرف چلتا کیا اور خود چپکے سے دوبارہ قبرستان میں جا پہنچا۔ قبر کے قریب ہی گورکن اپنا پھاوڑا چھوڑ گیا تھا۔ میں نے تابوت کھول کر لاش باہر نکالی اور اس پھاوڑے سے اسے اچھی

طرح کچل ڈالا جتنی تیزی سے لاش کا قیمہ بنتا جا رہا تھا۔ اتنی ہی سرعت سے میرا مزاج ٹھکانے آ رہا تھا اور جب لاش قطعی مسخ ہو گئی تو میں پسینے میں تر ہانپ رہا تھا عین اسی وقت قبرستان کا ایک گورکن ادھر آ نکلا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کچلی ہوئی لاش اٹھائی اور قبر میں چھپ گیا۔ وہ مجھے دیکھ چکا تھا لیکن اسے قریب آنے کی جرات نہ ہوئی اور وہ بری طرح چیختا ہوا ایک طرف بھاگ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں قبر سے نکلا اور قبرستان کی دیوار پر چڑھ کر باہر کود گیا اور ایک باغ میں جا چھپا۔ اسی وقت بارش دوبارہ ہونے لگی میں نے کان لگا کر سنا، قبرستان میں چوکیدار جمع ہو کر ایک دوسرے سے اونچی اونچی آواز میں کچھ کہہ رہے تھے۔ میں وہیں باغ میں ایک جگہ تین گھنٹے تک چھپا رہا اور پھر اپنی بیرک میں پہنچ گیا۔ اس دن سے لے کر اب تک مجھ پر یہ دورے مسلسل پڑتے رہے ہیں اور میں کوشش کے باوجود ان سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کوئی اور روح میرے بدن میں داخل ہو کر مجھے اس انسانیت سوز فعل پر اکساتی ہے۔

''بہر حال یہ واقعہ تھا۔ دو روز بعد رات کو میں پھر ایک اور قبرستان میں گیا، قبر کھود کر ایک تازہ لاش نکالی اور اس کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ بعد ازاں میں نے لاش کو دوبارہ قبر میں ڈال کر اپنے ہاتھوں سے مٹی پر کر دی۔ چند روز بعد میری رجمنٹ کو پیرس بھیج دیا گیا۔ چار ماہ تک میں اس مرض کے حملے سے محفوظ رہا۔ ایک روز میرے ایک دوست نے پیرس کے حسین قبرستان پیری لاشز کا ذکر کیا اور بتایا کہ اس قبرستان میں فرانس کی بہت سی مشہور ہستیاں دفن ہیں اور ان کی قبریں دیکھنی چاہئیں۔ میں نے ہر چند اسے ٹالنے کی کوشش کی مگر وہ مجھے ساتھ لے جانے پر مُصر رہا۔ میں ڈر رہا تھا کہ قبرستان میں پہنچتے ہی کہیں

دورہ نہ پر جائے اور آخر وہی ہوا۔ میں نے ایک بچے کی قبر کا تابوت دیکھا جسے گورکن نے ابھی بند نہ کیا تھا (یہ جنرل ڈیری سن کی کم سن بچی کی قبر تھی) تابوت کو دیکھتے ہی مجھ پر جنون کے آثار چھا گئے۔ لیکن میں نے انہیں ضبط کیا اور ارادہ کرلیا کہ دوبارہ آ کر اپنی حسرت پوری کروں گا۔ چنانچہ میں رات کے سناٹے میں قبرستان پہنچا اور چوکیداروں کی نظر بچا کر کھلے دروازے میں سے اندر چلا گیا اور تابوت سے لاش نکال کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر ڈالے اور روالپس اپنی بیرک میں پہنچ گیا۔ اس کے بعد دو ہفتے تک مسلسل میں قبرستان جاتا اور قبریں کھود کھود کر لاشوں کو چیرتا پھاڑتا رہا۔ لیکن اس جنونی حالت میں بھی مجھے اس بات کا خیال رہتا تھا کہ ان لاشوں کو حتی الامکان قبر کے اندر پھینک کر اوپر سے مٹی ڈال دوں تاکہ کسی کو شک نہ ہو"۔

فرینکومیس کے اس بیان پر کمرہ عدالت میں حد درجے سنسنی پھیل گئی اور سب لوگ دم بخود تھے عدالت کے جج کرنل منیسیلن نے چند منٹ غور کرنے کے بعد فرینکومیس سے چند سوالات دریافت کیے جن کے جوابات اس نے صاف صاف اور گھبراہٹ کے بغیر دیئے۔

سوال: کیا تم بتا سکتے ہو کہ لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا جنون تم پر کیوں طاری ہوتا تھا؟

جواب: جناب میں اس کی وجہ نہیں جانتا کہ میں ایسا کیوں کرتا تھا۔

سوال: کیا تم ایسی حرکت کرتے وقت مکمل ہوش و حواس میں رہتے تھے؟

جواب: بے شک! میں خوب اچھی طرح سمجھتا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ اور اس کام میں پکڑے جانے کا خطرہ بھی موجود ہے، تاہم میں اس خواہش کو کسی طرح بھی دبا نہیں سکتا تھا۔ مونٹ پرناس کے قبرستان کی دیوار پر چڑھتے

ہوئے جب میری ٹانگ میں گولی لگی تو اس وقت بھی میں ہوش میں تھا۔

اس موقع پر عدالت کے ایک رکن نے ان تمام واقعات کی تفصیل پڑھ کر سنائی کہ کون کون سے قبرستانوں میں کتنی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔ اس کے بعد جج نے فرینکو میس سے دریافت کیا۔

"کیا تمہیں اعتراف ہے کہ یہ سب حرکتیں خود تم نے کیں ہیں؟

"جی ہاں، ان کے علاوہ بھی کئی وارداتیں ایسی ہیں جو اس فہرست میں شامل نہیں اور جو آپ لوگوں کے علم میں نہیں آسکیں۔ بعض اوقات میں نے ایک ہی رات میں پندرہ پندرہ اور بیس بیس لاشیں قبروں سے نکال کر اپنے جذبے کی تسکین کی ہے میں ان سب لاشوں کو ٹکڑے کرنے کے بعد دوبارہ قبر میں ہی ڈال دیا کرتا تھا۔

سوال: ایسی وحشیانہ اور خلافِ قانون حرکتیں کرنے کا کوئی مقصد تمہارے پیش نظر تھا؟

جواب: میرے سامنے کوئی مقصد نہ تھا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ جوں ہی کوئی لاش میری نظروں کے سامنے آتی، ایک ناقابلِ برداشت جوش اور جنون میرے اندر سما جاتا اور جب تک میں لاش کو چیر پھاڑ نہ ڈالتا، میری تسکین نہ ہوتی، مجھے اس سے غرض نہ تھی کہ لاش مرد کی ہے یا عورت کی۔

سوال: تم لاشیں قبروں سے کیسے نکالتے تھے؟

جواب: میں اپنے ہاتھوں سے مٹی کھودتا۔ بعض اوقات میرے ہاتھوں سے خون بھی بہنے لگتا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے تکلیف، درد یا تھکن کا قطعاً احساس نہ ہوتا تھا، البتہ اگلے روز یہ سب باتیں شدت سے محسوس ہوتی تھیں اور میں تقریباً نڈھال ہو جاتا تھا۔

سوال: جب تمہارے اس وحشیانہ جذبے کی تسکین ہو جاتی تھی تو اس کے بعد تم کیا محسوس کرتے تھے؟ تفصیلاً بتاؤ۔

جواب: میں جب اپنی بیرک میں پہنچتا تھا تو تھوڑی دیر بعد مجھ پر کپکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد تیز بخار اور اسی دوران میں میری آنکھیں بند اور جسم قطعی بے حس و حرکت ہو جاتا تھا۔ میں دراصل گہری نیند سو جاتا تھا۔ لیکن یہ عجیب بات تھی کہ میں اپنے اردگرد گونجتی ہوئی تمام آوازیں سن سکتا تھا اور میرے ساتھی آپس میں جو کچھ گفتگو کرتے تھے۔ اس کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں پہنچتا تھا۔ دو یا تین گھنٹے یہی کیفیت رہتی اور پھر آنکھ کھلنے پر میں تھکن اور جسم کے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کرتا۔

(اگرچہ فرینکو میس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے جتنی لاشوں کی بے حُرمتی کی ہے ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ صرف عورتوں کی لاشوں پر حملہ کرتا تھا)

سوال: اچھا یہ بتاؤ کہ تم صرف عورتوں کی لاشوں ہی کو کیوں چیرتے پھاڑتے تھے؟

جواب: میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا، ممکن ہے وہ سب لاشیں عورتوں ہی کی ہوں، بہر حال صرف عورتوں کی لاشیں قبروں سے نکالنا میرا مقصد نہ تھا۔

سوال: کیا اس معاملے میں تمہاری جنسی تسکین کا ہاتھ تو نہ تھا؟

جواب: جی نہیں۔

سوال: بعض لاشوں کے معائنے سے پتا چلا کہ انہیں چبایا گیا ہے، کیا یہ صحیح ہے؟

جواب: جی نہیں، میں نے لاشوں کا گوشت ہرگز نہیں چبایا، صحیح بات یہ ہے کہ

لاشوں کے اعضاء الگ کرنے کے لئے میرے پاس ایک کند چاقو تھا، یہ اُسی چاقو کے نشانات ہوں گے۔ جنہیں دراصل میرے دانتوں کے نشان سمجھا گیا ہے۔

سوال: کیا تم لاشوں کے پیٹ چاک کر کے آنتیں باہر نکال دیتے تھے؟

جواب: جی ہاں، میں ایسا کرتا تھا، میری خواہش یہ ہوتی تھی کہ لاشوں کا کلیجہ نکال کر اسے ہاتھوں میں خوب مسلوں۔

(فرینکو میس کے اس فقرے سے کمرہ عدالت میں دہشت کی ایک لہر دوڑ گئی)

سوال: کیا تمہیں اپنی ان شرمناک حرکتوں سے خوف معلوم نہیں ہوتا تھا؟

جواب: جناب میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ ان حرکتوں کے باعث میرا ضمیر مجھ کو کس قدر ملامت کرتا تھا۔ مجھے اپنی ذات سے نفرت ہو گئی تھی۔ لیکن اس بد عادت سے چھٹکارا پانا میرے اختیار میں نہ تھا۔ قبرستانوں میں جب اسپرنگ گنیں لگائی گئیں، کتے چھوڑے گئے اور مسلح پہرے داروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا تو ان حالات کو جانتے بوجھتے ہوئے بھی میں قبرستان میں جانے پر مجبور تھا۔ حالاں کہ صریحاً میری جان کو خطرہ تھا۔ اور ایک مرتبہ تو مونٹ پرناس کے قبرستان میں اسپرنگ گن چل بھی گئی اور میں مرتے مرتے بچا۔ مگر میں نے پرواہ نہ کی اور ٹھوکر مار کر بندوق کو پرے پھینک دیا۔ اور قبریں کھود کر لاشیں نکال لیں۔ مجھے خوب یاد ہے کہ اس رات موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، لیکن میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک کے باوجود اپنا کام کرتا رہا۔ اس رات مونٹ پرناس کے قبرستان سے نکل کر میں آمیوری قبرستان میں گیا اور وہاں کئی لاشیں نکالیں پھر تین یا چار بجے صبح میں لکثمرگ کے قبرستان میں پہنچا اور وہاں سے

فارغ ہو کر اپنی بیرک میں آ گیا اور خوب سویا۔

سوال: اس مرض کا حملہ تم پر کب اور کتنی عرصے بعد ہوتا ہے؟

جواب: ہر دو ہفتے بعد...... دورہ پڑنے سے پیشتر ہی مجھے علم ہو جاتا ہے کہ وقت آ گیا ہے۔ پہلے میرے سر میں شدید درد شروع ہوتا ہے، یہ گویا مرض کی حملے کی پہلی علامت ہے۔

اس کے بعد فرینکو میس سے مختلف سوالات کیے گئے کہ وہ خونخوار کتوں سے کیوں کر محفوظ رہتا تھا۔ پہرے دار کی گولی اسے کیوں نہیں لگی اور دیوار پر کیسے چڑھتا تھا وغیرہ وغیرہ اس نے بتایا۔

"جب مرض مجھے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا تھا تو میں یوں محسوس کرتا تھا کہ جیسے کئی آدمیوں کی قوت مجھ میں سما گئی ہے۔ اس کیفیت میں میرے لئے کوئی بھی کام دشوار نہیں رہتا تھا۔ میں بندر کی طرح اونچی دیوار پر چڑھ سکتا تھا۔ اس کے علاوہ پیرس کے تمام قبرستانوں کی چپے چپے سے آگاہ ہو چکا تھا۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ دیوار کو کہاں سے عبور کیا جا سکتا ہے۔ ایک قبرستان کی دیوار کے باہر درخت ہے، میں اس درخت کے ذریعے متعدد مرتبہ قبرستان کے اندر گیا اور باہر آیا ہوں۔ ایک مرتبہ میں اسی درخت کی ایک شاخ پر بیٹھا تھا کہ ایک مسلح پہرے دار گھومتا ہوا ادھر آ نکلا اور اس نے مجھے دیکھ کر فوراً ہی دو فائر کیے، لیکن میں بچ کر بھاگ نکلا اسی طرح ایک مرتبہ جب میں ایک قبر سے نکل رہا تھا تو پہرے دار نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میرے اس قدر قریب تھا کہ چاہتا تو آسانی سے مجھے پکڑ لیتا، لیکن اتنی دہشت اس پر طاری ہوئی کہ وہ چیختا چلاتا وہاں سے بھاگ گیا۔ ایک دوسرے موقعے پر جب کہ میں قبرستان کی دیوار پر چڑھ رہا تھا، ایک پہرے دار نے پستول سے مجھ پر فائر کیا۔ گولی

میرے کوٹ کو چھیدتی ہوئی نکل گئی اور میں بچ گیا۔ اب رہا کتوں کا معاملہ تو میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے کتے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر ان سے ڈر کر بھاگا جائے تو یہ چشم زون میں تکا بوٹی کر ڈالتے ہیں۔ پس ان کتوں کو دیکھتے ہی میں اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا ہو جاتا اور ان کی طرف گھورنے لگتا تھا۔ کتے ایک دو منٹ تک میری ارد گرد گھومتے اور پھر دمیں دبا کر لوٹ جاتے ۔جناب میں نے اپنی زندگی میں آج تک کسی آدمی کو نقصان نہیں پہنچایا اور نہ میرا اس دنیا میں کوئی دشمن ہے۔

سارجنٹ فرینکو میس برٹرینڈ کا بیان ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر مارشل ڈی کاوی نے عدالت میں اپنی رائے پیش کی۔ ڈاکٹر مارشل فوج میں میجر تھا اور اس نے مقدمہ شروع ہونے سے کئی دن پہلے فرینکو میس سے طویل ملاقاتیں کی تھیں اور اس کا جسمانی و ذہنی معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ تیار کی تھی۔ فرینکو میس نے ڈاکٹر کو ایک تحریری بیان دیا تھا جس میں اس نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا تھا۔

ڈاکٹر نے عدالت سے کہا، میری رائے میں سارجنٹ فرینکو میس ''مجرم'' نہیں، بلکہ ایک عجیب اور پُراسرار دماغی مرض کا شکار ہے۔ اور اسے یہی حیثیت دے کر مقدمے کی کاروائی آگے بڑھائی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ جب وہ لاشوں کو قبروں سے نکال کر چیرتا پھاڑتا تھا تو اسے یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ یہ کام قانوناً اخلاقاً اور مذہباً غلط ہے۔ اور انتہائی گھناؤنے جرم کی ذیل میں آتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اس نے کہا، وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا کیوں کہ اس مرض کا دورہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ویسے وہ دماغی طور پر قطعی نارمل ،کیفیت کا حامل آدمی ہے، میں جس حد تک سمجھ چکا ہوں، اس کے مطابق فرینکو

میس کو مونو مینیا (Monomania) کا مریض کہا جا سکتا ہے، اور اسے سمجھنے کے لئے ہمیں مریض کے بچپن کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا میں عدالت کو فرینکو میس کے تحریری بیان کے ذریعے اس کے بچپن سے آگاہ کرتا ہوں۔ وہ لکھتا

''میری عمر جب سات آٹھ سال کی تھی تو اسی وقت سے کبھی کبھار میں اپنی طبیعت میں بے چینی محسوس کرتا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب ہی ایک اُجاڑ جنگل تھا، میں وہاں چلا جاتا اور جنگل کے سب سے تاریک حصے میں کئی کئی دن تک چھپا رہتا۔ گھر کے لوگ مجھے تلاش کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے اور اپنے ساتھ لے آتے۔ جنگل میں متواتر جانے سے بہت سے جنگلی جانور مجھے اچھی طرح پہچاننے لگے تھے، وہاں بھیڑیئے بھی تھے۔ جو مجھ سے اچھی طرح مانوس ہوگئے تھے اور مجھے کچھ نہیں کہتے تھے۔ مجھے ان جانوروں کے درمیان رہ کر نہایت سکون ہوتا تھا اور بارہا میں سوچتا کہ اگر میں بھی ان ہی جانوروں اور بھیڑیوں کی طرح طاقت ور اور وحشی ہوتا تو مجھ سے سب ہی ڈرتے۔

ڈاکٹر کاوی، نے عدالت کو بتایا کہ ''مونو مینیا کے مریض بڑی حد تک جنسی انتشار کا شکار بھی ہوتے ہیں اور جیسا کہ موجودہ کیس میں فرینکو میس کی حرکتوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ لاشعوری طور پر صرف عورتوں کی لاشوں کو قبروں سے نکالا کرتا تھا۔ لیکن اسے اس کا احساس ہی نہیں تھا، تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ عورتوں کی لاشیں بالکل اتفاقیہ طور پر اس کے ہتھے چڑھتی رہی ہوں اور اس میں خود فرینکو میس کی مرضی کو کوئی دخل ہو۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر نے عدالت کو فرینکو میس کے تحریری بیان ہی میں سے ایک اور حصہ پڑھ کر سنایا جس میں فرینکو میس نی بعض فوجی دوستوں کے سامنے اپنی جنسی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا۔

جج نے ڈاکٹر کاوی سے سوال کیا۔

''آپ کی رائے میں فرینکو میس کو اپنی حرکتوں پر کنٹرول حاصل ہو سکتا تھا؟''

''جی نہیں یہی تو اس کا اصل مرض ہے کہ وہ اپنے جرم اور گناہ کی اہمیت جاننے کے باوجود انہیں کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ پرانے زمانے میں بھی ایسے مریض پائے جاتے تھے، لیکن اس وقت یہ کہہ کر بات ٹال دی جاتی تھی کہ ان کے جسموں میں بد رُوحیں سما گئی ہیں۔ بہر حال میں ان حالات کی روشنی میں عدالت سے سفارش کرتا ہوں کہ فرینکو میس برٹرینڈ کو جیل بھیجنے کے بجائے دماغی امراض کے شفا خانے میں داخل کیا جائے ممکن ہے اس کے مرض کا علاج ہو سکے''

ڈاکٹر کاری کی اس سفارش پر کمرہ عدالت میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور لوگوں نے، جو فرینکو میس کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے، اعلانیہ کہا کہ فوجی ڈاکٹر اس بدترین اور ظالم مجرم کو قانون کی گرفت سے بچانا چاہتا ہے۔ اس مرحلے پر عدالت کے صدر نے ڈاکٹر کاوی سے آخری سوال کیا۔

''ڈاکٹر، آپ کی رائے میں، قانونی طور پر فینکو میس برٹرینڈ ان بھیانک جرائم کا ذمے دار ہے یا نہیں؟

''بلا شبہ قانونی طور پر وہ مُجرم ہے، کیوں کہ جب وہ جُرم کا ارتکاب کرتا تو اسے بہ ہوش و حواس یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک غلط کام کر رہا ہے۔ ڈاکٹر نے تسلیم کیا۔

عدالت نے تھوڑی دیر بعد اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ فرینکو میس برٹرینڈ کو آگ میں زندہ جلایا جائے گا۔

ایک سو ستر سال پیشتر فرینکو میس برٹرینڈ کو قبروں سے لاشیں نکال کر چیر پھاڑ ڈالنے کے جرم میں زندہ جلا دیا گیا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ایسے مریضوں کے بارے میں طرح طرح کے توہمات اور داستانیں عوام و خواص میں مشہور ہو جایا کرتی تھیں اور لوگ انہیں شیطان اور بدروحیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نفسیاتی امراض کی تشخیص اور ان کے علاج کا طریقہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن اب ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ فرینکو میس لائیکینتھروپی (Lycanthropy) کا ایک بہترین اور نادر کیس تھا۔ طبی اصطلاح کے مطابق اس مرض کا مریض دورہ پڑنے کے بعد اپنے آپ کو انسان کی بجائے کسی خونخوار بھیڑیے یا وحشی درندے کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اور درندوں جیسی حرکتیں ہی کر کے تسکین حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں سے قبروں کو کھود کر لاشیں نکال لیتا ہے اور انہیں خوب چیر پھاڑ کر دوبارہ قبروں میں پھینک دیتا ہے اور موقع ملے تو وہ زندہ افراد پر بھی حملہ کر دیتا ہے۔ فرینکو میس نے زندہ افراد پر حملہ نہیں کیا اور اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کا مرض ابھی ابتدائی درجے میں تھا۔ اگر اسے پکڑا نہ جاتا تو ممکن تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ زندہ افراد پر بھی حملے شروع کر دیتا۔

لائیکینتھروپ یا اپنے آپ کو "انسانی بھیڑیا" خیال کرنے کے مریض ہر دور اور ہر ملک میں پائے جاتے رہے ہیں اور اب بھی ان کے ناپاک وجود سے دنیا خالی نہیں ہوتی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں، یورپی ملکوں میں اس خطرناک مرض کے مریض بہت زیادہ تھے۔ سولہویں صدی عیسوی میں تو یہ مرض وباء کی طرح شہروں، قصبوں اور ایک ہی خاندان کے کئی کئی افراد کو لاحق ہو گیا تھا۔ چناں چہ اس مرض کا حملہ ہوتے ہی ایسے لوگ گھر بار چھوڑ کر

جنگلوں میں چلے جاتے وہاں اپنے بال اور ناخن بڑھاتے رہتے اور جب ظاہری شکل وصورت میں بھی درندے سے مشابہہ ہوجاتے تو راہ گیروں پر حملے کر کے انہیں ہلاک کر ڈالتے اوران کے گوشت سے اپنا پیٹ بھرتے۔

اسی سولھویں صدی کے بالکل آغاز میں، جب کہ یہ مرض فرانس میں پھیلا ہوا تھا اور ''انسانی بھیڑیے'' جنگلوں میں پھر رہے تھے، دو انسانی بھیڑیوں نے بڑی شہرت پائی، ان میں سے ایک کا نام تھا پیری برگٹ اور دوسرے کا مائیکل ورڈن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ یہ دونوں مل کر مسلسل انیس سال تک زندہ انسانوں کو ہلاک کر کے ہڑپ کرتے رہے، ہلاک کیے گئے افراد کی لاشیں جب جنگلوں میں ملتیں تو ان کے جسموں پر پڑے ہوئے زخموں کے نشانات سے یہی اندازہ کیا جاتا کہ ان بدنصیبوں کو بھیڑیوں نے ہلاک کیا ہے۔

۱۵۲۱ء میں یہ دونوں پکڑے گئے۔ واقعہ یہ تھا کہ ورڈن نے جنگل سے گزرنے والے ایک راہ گیر پر حملہ کیا۔ راہ گیر کے پاس تلوار تھی۔ اس نے ورڈن کو شدید زخمی کر دیا اور خود بچ کر بھاگ گیا اور شہر پہنچ کر ساری داستان پولیس کو سنائی۔ اسی وقت مسلح جوانوں کا ایک دستہ جنگل میں گیا اور خون کے دھبوں سے سراغ لگا کر ورڈن کو پکڑ لیا جو ایک جگہ پڑا زخموں کی تکلیف سے مجبور ہو کر کراہ رہا تھا۔ ورڈن کی نشان دہی پر پیری برگٹ کو بھی پکڑ لیا گیا اور انہوں نے جب اپنے جرائم کی داستان سنائی تو لوگوں کے دل دہل گئے انہوں نے بتایا کہ جب وہ بھوک سے بے تاب ہو جاتے اور کوئی شکار نہیں ملتا تھا تو بھیڑیوں کی فطرت کے مطابق کسی بستی یا گاؤں میں چلے جاتے اور وہاں کھیلتے ہوئے بچوں میں سے ایک دو کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں ہلاک

کر کے اپنا پیٹ بھر لیتے تھے۔ برگٹ نے بتایا۔

''ہمارے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا، چوں کہ ہم تو بھیڑیے تھے، اس لئے اپنے شکار پر دانتوں اور پنجوں سے حملہ کرتے تھے۔ ان دونوں کو بعد ازاں زندہ جلا دیا گیا۔

اسی طرح گلیز گارنر کو بھی فرانس کے لوگ نہیں بھول سکتے۔ ۱۵۷۲ میں یہ شخص قصبہ ڈولے کے نزدیک رہتا تھا کہ اس وحشیانہ مرض کا شکار ہو گیا۔ ابتداء میں ایسا ہوا کہ گاؤں والوں کو گمشدہ بچوں کی کھائی ہوئی لاشیں ملنے لگیں اور انہوں نے حسبِ معمول جنگلی بھیڑیوں کے سر پہ الزام تھوپ دیا کہ ان بچوں کو ہلاک کرنے کے ذمے دار یہ درندے ہیں۔ لیکن ایک روز گارنر نے ایک نوجوان لڑکی پر حملہ کیا۔ لڑکی کی چیخیں سن کر قریب ہی کھیتوں میں کام کرنے والے کسان دوڑے ہوئے آئے اور ان میں سے ایک نے دیکھا کہ انسان نما کوئی جانور اپنے ہاتھوں اور پیروں کے بل تیزی سے دوڑتا ہوا جنگل کی طرف جا رہا ہے۔ انہوں نے بے ہوش لڑکی کو اٹھایا اور گاؤں میں لے گئے۔ ٹھیک ہونے کے بعد بھی لڑکی اتنی دہشت زدہ تھی کہ وہ کچھ بتا نہ سکی، تاہم کسانوں نے کورٹ آف پارلیمنٹ کی اجازت سے اپنے پاس اسلحہ رکھنا شروع کر دیا۔ چند روز بعد گاؤں سے دس سال کا ایک لڑکا غائب ہو گیا۔ ایک ہفتے بعد گاؤں پیروزی میں بھی ایسی ہی واردات ہوئی۔ معصوم لڑکے کی چیخیں سُن کر کسانوں نے اپنی بندوقیں سنبھال لیں اور جلدی سے موقعے پر پہنچے۔ انہوں نے ایک آدمی نما بھیڑیے کو دیکھا جو لڑکے کی لاش کو اپنے دانتوں سے پکڑے ہاتھوں اور پیروں کے بل دوڑتا ہوا جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ کسان اس کے تعاقب میں دوڑے، لیکن گارنر اُن سے زیادہ تیز بھاگ رہا تھا، تاہم اسے

کسانوں نے گھیر کر پکڑ لیا۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ گارنز نے تقریباً ایک درجن بچوں کو ہلاک کیا۔ وہ انھیں ہلاک کر کے اپنی جھونپڑی میں لے جاتا اور گوشت سے اپنا پیٹ بھر لیتا۔

اس پر مقدمہ چلایا گیا اور گارنز نے اقرار کیا کہ اس نے ان تمام بچوں کو ہلاک کیا، لیکن صرف اسی وقت جب کہ وہ اپنے آپ کو بھیڑیا سمجھتا تھا۔ برگٹ اور روڈن کی طرح اسے بھی زندہ جلا دیا گیا۔

''انسانی بھیڑیا بن جانے کی سب سے زیادہ دلچسپ اور خوفناک مثال پیٹر سٹمپ نامی ایک شخص کی ہے جو جرمنی کا رہنے والا تھا اور سولھویں صدی کے آخر میں اس کی لرزہ خیز داستان سامنے آئی تھی۔ سٹمپ نے ''انسانی بھیڑیا'' بن کر ۱۳ بچوں، دو عورتوں اور ایک آدمی کو ہلاک کیا تھا۔ دل چسپ بات یہ کہ ان ہی دنوں جرمنی کے ایک قصبے کے لوگن کے گرد و نواح میں بہت سے ''انسان بھیڑیئے'' اپنی ہلاکت خیز سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ان میں اکثر کو پکڑنے کے بعد مارا جا چکا تھا۔ اور بعض کی تلاش جاری تھی۔ پیٹر سٹمپ اپنے علاقے کا ایک معزز اور شریف آدمی تھا اور اس کے پاس اپنی بندوق بھی تھی، چناں چہ ''انسانی بھیڑیوں'' کو تلاش کرنے والی پارٹی میں اسے بھی شریک کر لیا گیا، لیکن اس دوران میں اس شخص کو خود اس مرض نے آن دبوچا اور وہ بھیڑیا بن گیا اور بچوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔

مارچ ۱۵۹۰ء میں اس نے سات آٹھ برس کی ایک معصوم بچی پر حملہ کیا اور اس کی گردن اپنے دانتوں میں دبا لی۔ قریب ہی مویشی گھاس چر رہے تھے۔ بچی نے اس وقت موٹے کپڑے کا کوٹ پہن رکھا تھا جس کا کالر اونچا اور سخت تھا، اور اسی لئے انسانی بھیڑیئے کے دانت اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا

سکے۔ بچی چیختی چلائی تو گاؤں والوں کو پتا چل گیا۔ بھیڑیئے نے بچی کو چھوڑا اور اپنی جان بچا کر بھاگا، لیکن گاؤں والوں نے کتے اس کے تعاقب میں لگا دیئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ پیٹر سٹمپ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے بل نہایت برق رفتاری سے دوڑا جا رہا ہے۔ اور کتوں کو بھی پیچھے چھوڑ گیا ہے۔ آخر کار بہت بھاگ دوڑ کے بعد وہ ایک ندی کنارے گھیر لیا گیا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ وہ پکڑا جائے گا تو وہ بھیڑیئے کا روپ چھوڑ کر انسان بننے کی کوشش کرنے لگا اور لوگوں سے کہا کہ اسے کچھ پتہ نہیں کہ اس نے کیا جرم کیا ہے۔ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے چاقو چھریاں مار مار کر وہیں ختم کر دیا۔ ماہرین نفسیات کی رائے میں انسانی بھیڑیا بن جانے والے لوگوں پر ایک قسم کی جنسی بیماری کا حملہ ہوتا ہے۔ جسے انہوں نے Oral Sadism کا نام دیا ہے۔ ایسا مریض اپنی جنسی تسکین ایک نرالے طریقے پر کرتا ہے۔ وہ انسانی گوشت کو اپنے دانتوں میں پکڑتا ہے اسے چباتا ہے اور کھا بھی جاتا ہے۔ اسے اگرچہ اپنے جرم کا احساس ہوتا ہے، لیکن وہ بہر حال اپنی جنسی تسکین پوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی ملامت اور جرم کا احساس ہوتا ہے، لیکن وہ بہر حال اپنی جنسی تسکین پوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی ملامت اور جرم کے تکلیف دہ ذہنی عذاب سے بچنے کے لئے ایسا مریض اپنے آپ کو کسی ''وحشی درندے'' کے رُوپ میں لے آتا ہے اور ظاہر ہے کسی درندے پر یہ جرم ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ وہ گوشت کیوں کھاتا ہے۔ اس لئے کہ اپنے شکار پر حملہ کرنا، اسے نوچنا، ہلاک کر دینا اور پھر اس کا گوشت چبانا درندے کی فطرت میں داخل ہے۔ ایسا مریض اپنے آپ کو اکثر بھیڑیئے، چیتے اور شیر کے روپ میں دیکھتا ہے چنانچہ قدیم ہندوستان میں اور اب بھی ایسے افراد پائے گئے ہیں۔ جو

مصنوعی شیر یا چیتے بن کر جنگلوں میں چھپے رہتے ہیں اور راہگیروں پر حملے کر کے انہیں ہلاک کر ڈالتے ہیں۔ یہی حال افریقہ میں بھی ہے امریکا کے انڈین قبائل میں بھی اس مرض کے مریض موجود ہیں جو "ریچھ" کا روپ دھار لیتے ہیں اور قرون وسطیٰ میں جب یہ مرض یورپ میں شدت سے پھیلا تو لوگ بھیڑیے بن گئے، ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ لوگ "وحشی درندے" کا روپ اپنے علاقے اور ماحول کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ میں بھیڑیوں کی بڑی کثرت تھی اور ان کے ہاتھوں لوگ بہت پریشان تھے لیکن جب انسانی بھیڑیوں کا سراغ ملا تو لوگوں نے اصلی بھیڑیوں کو چن چن کر ہلاک کرنا شروع کر دیا اور ان کا مکمل صفایا ہی کر دیا۔ یہ اصلی بھیڑیے انسانی بھیڑیوں کی حرکتوں کا الزام اپنے سر لیتے تھے، لیکن جب یہ نیست و نابود ہو گئے تو انسانی بھیڑیوں نے اپنے آپ کو درندہ سمجھنا چھوڑ دیا۔

۱۸۰۹ء میں انڈریس بائیکل نامی ایک بھیڑیا پکڑا گیا جس نے بہت سی کم عمر لڑکیوں کو ہلاک کیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ لڑکیوں کے زیور یا کپڑوں کے لئے انہیں ہلاک کرتا تھا، لیکن آخر میں اس نے اعتراف کیا کہ وہ بعد میں ان لڑکیوں کی ٹانگیں اور بازو کاٹ کر انہیں اپنے ناخنوں اور دانتوں کے ذریعے نوچا کرتا تھا۔ ٹانگیں اور بازو کٹ جانے کے بعد بھی بعض لڑکیاں زندہ رہتی تھیں۔ بائیکل کا بیان تھا "جب میں کسی لڑکی کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ ڈالتا تھا تو اس وقت میرے جوش اور اضطراب کی کوئی حد نہ رہتی تھی۔ میرا جسم تھر تھر کانپتا تھا، لیکن میں اس حالت کو دبا نہیں سکتا تھا اور یہ کیفیت اس وقت ختم ہوتی تھی جب میں اپنے ہاتھوں سے نوچا ہوا گوشت ہڑپ کرتا تھا۔

۱۸۴۷ء میں ایک آسٹرین فقیر سوائی تک نامی پکڑا گیا۔ اس نے اپنے لمبے کوٹ کے اندر لڑکی کا کٹا ہوا سر چھپا رکھا تھا۔ اس فقیر نے اعتراف کیا کہ وہ اب تک تقریباً چودہ بچوں کو ہلاک کر کے ہڑپ کر چکا ہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس فقیر کی بیوی بچے بھی تھے اور بھیک مانگنے سے اسے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ آدم خور تھا۔ لیکن اس میں "انسانی بھیڑیئے" کی علامت نہیں پائی گئی۔

☆☆☆

ایک ہولناک سفر

(مقبول جہانگیر)

۲۰ جون ۱۸۲۲ء کا ذکر ہے۔ تین برطانوی جہاز بحرِ اوقیانوس کے جنوب مغربی حصے میں سفر کر رہے تھے۔ فیم" نامی جہاز کا کیپٹن فیدرسٹون عرشے پر کھڑا آنکھوں سے دُوربین لگائے افق تک پھیلے ہوئے نیلے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ یکا یک اس کا نائب بول اٹھا۔

"وہ......وہ مغرب کی طرف......ایک تباہ شدہ کشتی؟"

کیپٹن نے اثبات میں سر ہلایا، ہاں ہاں، ہچکولے کھاتی ہوئی تباہ شدہ کشتی کا عرشہ صاف نظر آ رہا ہے" چند لمحے دُوربین سے دیکھنے کے بعد اس نے کہا۔"زندہ لاشوں کی طرح دو آدمی کشتی میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ایک چھجے کے پاس کھڑا ہاتھ سے اشارہ کر رہا ہے اور دوسرا قریب ہی عرشے پر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔

کیپٹن فیدرسٹون نے نائب کو دوربین دیتے ہوئے جیب سے سیٹی نکال کر زور سے بجائی پھر چلا کر کہنے لگا۔......او......ادھر دیکھو......میں "فیم" جہاز کا کیپٹن فیدرسٹون ہوں......تم کون ہو......؟"

اتنا سنتے ہی اس شخص نے ہاتھ ہلانا بند کر دیا اور چند لمحے بعد لڑکھڑاتا ہوا عرشے پر گر پڑا دوسرے آدمی نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپالیا اور رونے لگا۔ کیپٹن فیدرسٹون چیخ چیخ کر انہیں آواز دے رہا تھا، لیکن اس کے بعد تباہ شدہ کشتی سے کوئی جواب نہ ملا......

****

اس زمانے میں یوں تو سینکڑوں جہاز چین اور دوسرے ممالک سے بوسٹن کی بندرگاہ تک ریشم، چائے اور مختلف تجارتی اشیاء لاتے تھے، لیکن نزدیکی بندرگاہوں سے مال برداری کے لئے سینکڑوں چھوٹی چھوٹی کشتیاں دن رات مصروف رہتی تھیں۔ ۸۰۰ فیٹ لمبی اور ۱۳۰ ٹن وزنی بے ڈول سی کشتی ''پولی'' بھی ان ہی میں سے ایک تھی اور کیپٹن سز ینو کو اس پر فخر تھا۔

۱۵ دسمبر ۱۸۱۱ء کو ''پولی'' چار دن تک بوسٹن کی بندرگاہ سے باہر رہی۔ کیپٹن سز ینو عرشے پر کھڑا نیلگوں پانی کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ اب تک ان مشکلات پر قابو پا چکا ہے۔ جو دوسرے سینکڑوں جہازوں اور کشتیوں کے لئے تکلیف دہ بنی ہوئی تھیں۔ وہ خلیج کوڈ کی تہہ میں جمی ہوئی ریت اور کوڑا کرکٹ صاف کر چکا تھا۔ جس کی وجہ سے خلیج کے موڑ پر بہت سے جہاز حادثات سے دوچار ہو چکے تھے اور اس راستے کو جہاز رانی کے قابل بنا کر برطانوی بحری حملہ آوروں سے بچاؤ کی صورت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ جو آئے دن تجارتی جہازوں اور کشتیوں کے عملے کو پکڑ لیتے اور مال اسباب لوٹ لیتے تھے۔ اس وقت ''پولی'' خلیج سٹریم میں رواں تھی جہاں جہاز رانی بہت آسان تھی۔ پولی میں کیپٹن سز ینو کے علاوہ نتھی نیل پیڈ کاک، ہندوستانی خانساماں ماہُو، سیمیول پیڈ گر، ڈینیل ہُو، جانسن اور سویڈن کا رہنے والا ایک ملاح سوار تھے۔ ان کے علاوہ مسافروں میں مسٹر جے، ایس ہینٹ اور ایک گیارہ سالہ حبشی لڑکی بھی شامل تھی۔ اس مرتبہ دُور کی چند بندرگاہوں سے سامان لانے میں چار دن لگ گئے تھے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۱۱ء کو آدھی رات کا وقت تھا۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا شدت اختیار کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہی بارش

ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اونچی اونچی موجیں ''پولی'' سے ٹکرانے لگیں۔ ''پولی'' ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا عرشہ لرز رہا تھا۔ جنوب مغرب کی طرف سے سمندر میں طوفان بڑھا چلا آ رہا تھا۔ کیپٹن سز ینو بادبان کا رسا تھامے یہ منظر خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش کی علامات اُبھر رہی تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے اس نے جنوب مغرب کی طرف بپھری ہوئی موجوں پر نظر ڈالی اور عرشے پر ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے ملاحوں کا حوصلہ بڑھانے لگا۔ اس نے عرشے کا ایک چکر لگایا۔ عملے کے تمام افراد کسی نامعلوم خوف کے زیر اثر بدحواس ہو گئے تھے۔ کشتی طوفان کا مقابلہ کرتی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی، لیکن طوفانی ہوائیں لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھیں۔ پہلا بادبان پھٹ چکا تھا اور کشتی ایک کھلونے کی طرح پانی میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ تمام عملہ کشتی کو طوفان سے بچانے کے لئے اپنی کوششوں میں مصروف تھا۔ تیز بارش اور موجوں کی بوچھاڑ کی باعث آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ طوفانی ہواؤں کے زور سے مستول نرم بانس کی طرح جھکے جا رہے تھے۔ کیپٹن سز ینو اپنے عملے کی مدد سے ''پولی'' کی رفتار کم کرنے کے لئے مسلسل جھٹکوں اور تھپیڑوں کی وجہ سے ''پولی'' کی نچلی منزل میں کئی درزیں پیدا ہو گئیں۔ اور پانی آہستہ آہستہ نچلی منزل میں بھرنے لگا۔ دو گھنٹے تک ''پولی'' پُرشور موجوں میں ہچکولے کھاتی رہی۔ کوئی ڈیڑھ بجے کا عمل تھا کہ وہ اچانک تنکے کی طرح کانپی اور چشم زدن میں الٹ گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ مردہ وھیل مچھلی کی طرح پہلو کے بل پانی پر تیر رہی تھی۔

****

کیپٹن سزینو اور عملے کے دوسرے آدمی بادبانوں کے رسوں سے چمٹے ہوئے دل میں سوچ رہے تھے کہ سمندر کی بے رحم موجیں ہمارے حوصلوں کو پست نہیں کرسکتیں۔ جب تک ہم زندہ رہیں گے۔ ''پولی'' ڈوب نہیں سکتی۔ کیپٹن سزینو اگرچہ گردن تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن اس نے دونوں ہاتھوں سے مستول تھام رکھا تھا۔ موجوں کی زبردست ریلے ان کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ کیپٹن نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بوچھاڑ میں دیکھا کہ عملے کے آدمی پھٹے ہوئے بادبانوں اور مستول پر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہ دیکھ کر کیپٹن لمحے بھر کے لیے حیران ہوا کہ سیمول بیڈگر کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی ہے جس کے ذریعے وہ رسیاں کاٹ کاٹ کر مستول تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''رسے اور مستول کاٹ دو۔'' کیپٹن سزینو کی آواز تیز ہوا میں ابھری ''اگر مستول اور رسے کاٹ دیے جائیں تو ''پولی'' سیدھی ہو جائے گی''۔

دوسرے ہی لمحے بیڈگر جوش سے ''پولی'' کا اگلا مستول کاٹ رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تھک گیا اُس کے بعد کیپٹن سزینو نے بیڈگر کے ہاتھ سے کلہاڑی چھینی اور مستول کاٹنے لگا۔ دونوں کی کوشش کے نتیجے میں تقریباً پون گھنٹے بعد ''پولی'' کا اگلا مستول کٹ کر موجوں میں بہہ گیا۔

ہوائیں اب بھی چیخ رہی تھیں اور آسمان سے پانی مسلسل برس رہا تھا۔ دیو پیکر موجیں بار بار آتیں اور ''پولی'' سے ٹکرا جاتیں۔ اب تمام لوگ باری باری بڑے مستول کو کاٹنے میں لگے ہوئے تھے جو ڈیڑھ گھنٹے کی کوشش کے بعد ''پولی'' سے الگ ہو گیا۔ بڑے مستول کا الگ ہونا تھا کہ ''پولی'' نے پلٹا کھایا اور سیدھی ہو گئی ''پولی'' کے سیدھے ہوتے ہی عملے میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب

نے اپنے اپنے چاقو نکالے اور بادبانوں کے تمام چھوٹے بڑے رسے کاٹ کر عرشے کے ایک طرف پھینک دیئے۔

تمام لوگ پانچ گھنٹے کی محنت کے بعد اس قدر تھک گئے تھے کہ کام ختم کرتے ہی عرشے پر لیٹ گئے۔ اونچی اونچی لہریں ان پر پانی پھینک رہی تھیں، لیکن وہ اس سے بے نیاز صرف یہ سوچ کر خوش تھے کہ ابھی زندہ ہیں۔

مشرق سے جب شفق کی سرخی نمودار ہوئی تو کیپٹن سز ینو نے دیکھا کہ اس کی ساتھیوں میں سے کئی ایسے ہیں جن کے کپڑے پھٹ چکے ہیں۔ طوفان کی شدت میں کمی واقع ہو چکی تھی۔ جنوب مغرب کی طرف سمندر پرسکون تھا۔ کیپٹن نے عرشے کا ایک چکر لگایا پچھے میں پھنسے ہوئے رسوں کو الگ کیا۔ عملے کے تمام لوگ بچ گئے تھے، لیکن ایک شخص جے۔ ایس سینٹ طوفان کی نذر ہو چکا تھا۔ گیارہ سالہ حبشی لڑکی مستول کے رسوں میں الجھی ہوئی مل گئی۔ موجوں کی زبردست تھپیڑوں کی وجہ سے اس کی حالت اتنی غیر تھی کہ چند گھنٹے بعد ہی اس نے دم توڑ دیا۔

کیپٹن سز ینو، سمیول پیڈ کاک، چار ملاح اور ہندوستانی خانساماں ہو بچ گئے تھے۔ لیکن اب وہ ایک ایسی کشتی پر سوار تھے جو موجوں کے رحم و کرم پر بھٹک رہی تھی اور جس کی کوئی منزل اور کوئی کنارہ نہ تھا۔

"پولی" کا اچھی طرح جائزہ لیا گیا۔ نچلی منزل میں پانی بھر چکا تھا۔ بڑی کوشش کے بعد نمکین گوشت کے تین ڈرم عرشے پر لائے گئے۔ تیس گیلن کے سوا پینے کا پانی ضائع ہو چکا تھا۔ کیپٹن سز ینو نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس خوراک کافی ہے، لیکن پانی کا ذخیرہ بہت کم ہے جب

تک کوئی صورت پیدا نہیں ہوتی، ہمیں چاہیے کہ چند گھونٹ روزانہ پانی پی کر گزارہ کریں۔ ہمارے پاس آگ جلانے کا کوئی انتظام نہیں، اس لئے ہمیں کچا نمکین گوشت ہی کھانا پڑے گا۔ بہر حال خدا کا شکر ہے کہ ہمارے پاس خوراک موجود ہے۔

اگلی صبح طوفان بالکل تھم چکا تھا، دور تک پھیلا ہوا سمندر قالین کی طرح نظر آ رہا تھا۔ دُھوپ میں البتہ بڑی حدت تھی۔ بادبانوں اور مستولوں کے بغیر ''پولی'' جنوب مغرب کی طرف بڑی سست رفتاری سے کسی اَن جانی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

بارہ دن گزر گئے...... دسمبر کا مہینہ ختم ہو چکا تھا اور پولی ابھی تک سمندر کے بیکراں سینے پر بھٹک رہی تھی۔ تمام لوگوں کے چہرے ڈاڑھی اور مونچھوں میں چھپ گئے تھے اور وہ کسی پراسرار خوف کے باعث بدحواس نظر آتے تھے، کشتی میں عجیب سراسیمگی پھیلی ہوئی تھی۔ کچا اور نمکین گوشت کھانے کی وجہ سے سب کی پیاس غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ پانی کی قلت کی وجہ سے چند گھونٹ پینے پر مجبور تھے۔ دھوپ سے بچاؤ کا ان کے پاس کوئی سامان نہ تھا۔ رات کو حد سے زیادہ ٹھنڈ ہو جاتی، وہ ٹھٹھرتے رہتے اور صبح جب سورج نکلتا تو ان کے جسموں میں کچھ جان سی پڑتی، لیکن دوپہر کے وقت سورج کی حدت ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ اُن کے جسم دُھوپ میں تپ تپ کر سیاہ پڑ چکے تھے، وہ ایک دوسرے سے بہت کم بات کرتے اور سارا دن باری باری عرشے پر گھوم کر کسی آتے جاتے جہاز کی تلاش میں افق پر نظریں جمائے رکھتے۔

بارہویں دن سمیول بیڈ گرنے عرشے پر گوشت کا ایک ٹکڑا پھینکتے ہوئے کہا۔

''یہ کھانے کے قابل نہیں، اگر ہم اسی طرح کچا اور نمکین گوشت کھاتے رہے تو جلد ہی بیمار پڑ جائیں گے۔ ہمیں کسی طرح پکانے یا بھوننے کے لئے آگ جلانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔

ہندوستانی خانساماں ماہو غور سے بیڈگر کی بات سُن رہا تھا۔ اچانک اسے آگ جلانے کی ایک عجیب ترکیب سوجھی، جو اس کے آبا و اجداد کے وقت سے چلی آ رہی تھی، اس نے اپنی پیٹی سے چاقو نکالتے ہوئے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''میں آگ جلاؤں گا''۔

کیپٹن سز ینو اور عملے کے دوسرے آدمی ماہو کے اردگرد جمع ہو گئے، ماہو نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ اُس نے سب سے پہلے مستول کے بچے ہوئے حصے سے چھوٹی چھوٹی لکڑیاں بڑی احتیاط سے کاٹیں پھر چھجے سے ایک صاف اور پتلی سی تختی کاٹی اور اس کے بعد چھجے کے موٹے فریم سے بلوط کی لکڑی کی دو سوکھی تختیاں کاٹیں۔ ان تمام لکڑیوں کو لے کر ماہو عرشے کے کونے میں بیٹھ گیا اور چھیل کر ان تختیوں کی سطح ہموار کی۔ اس کے بعد اس نے ایک تختی کو دوسری تختی پر رگڑنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں دوسرے ملاحوں نے عرشے کے کونے میں پڑے ہوئے رسے اور پٹ سن کی باریک باریک رسیاں جمع کر دیں اب عملے کے تمام آدمیوں کو آگ روشن ہونے کا شدت سے انتظار تھا۔ لکڑیاں آپس میں رگڑتے رگڑتے ماہو کے جسم سے پسینہ بہنے لگا تقریباً آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن آگ جلنے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ سب لوگ بد دل ہو گئے تھے۔ ایک ملاح نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میں نے سُنا ہے پرانے زمانے میں یہ ہندوستانی لوگ اسی طرح

آگ جلایا کرتے تھے"

"لیکن مجھے اس طریقے پر یقین نہیں۔" دوسرے نے جواب دیا۔

کیپٹن سزینو ماہو کو لکڑیاں رگڑتے ہوئے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور پُراعتماد نظر آتا تھا ماہو پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ بلوط کی لکڑی سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا اور پھر اچانک لکڑی ایک طرف سے جلنے لگی۔ کیپٹن سزینو اس کامیابی پر دیوانوں کی طرح چیخا۔ دوسرے ملاح بھی خوشی سے ناچنے لگے اور جوش میں آکر انہوں نے ماہو کو کندھوں پر اٹھالیا۔

ماہو کے اس کارنامے پر سب خوش تھے۔ جلتی ہوئی لکڑی کو عرشے کے کونے میں جمع کی گئی لکڑیوں اور رسیوں کے ڈھیر میں رکھ کر آگ جلائی گئی اور بچے ہوئے مستول سے مزید چھوٹی چھوٹی لکڑیاں کاٹ کر آگ کے قریب ہی رکھ دی گئیں تا کہ آگ نہ بجھ سکے۔ تھوڑا سا کچا اور نمکین گوشت بھونا گیا اور باقی گوشت پیپوں میں ڈال کر ابالا گیا۔ اس رات انہوں نے اتنا پیٹ بھر کر خوشی خوشی لذیذ گوشت کھایا کہ حادثہ پیش آنے سے اب تک اتنا لذیذ گوشت کھانا نصیب نہ ہوا تھا۔ لیکن انہیں ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ کشتی کے نچلے حصے کے تختے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کچے اور نمکین گوشت کے تمام ڈرم سمندر میں ڈوب چکے ہیں۔

****

"پولی" کو سمندر میں بھٹکتے ہوئے چالیس دن گزر گئے، اگرچہ اب تک انہیں خوراک کی کوئی کمی نہ رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب ہڈیوں کا

ڈھانچہ بن گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور کپڑوں سے بُو اٹھنے لگی تھی۔ سمندر کے نمکین پانی کی بوچھاڑ اور سورج کی حدت کے باعث ان کے جسموں پر آبلے سے پڑ چکے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوڑھ کے مریض ہیں۔ پانی کا ذخیرہ ۱۸ دن میں ختم ہوگیا تھا۔ کبھی بارش ہوتی تو وہ پیپوں میں پانی جمع کر لیتے جو چند دن تک کام آتا لیکن پانی اتنی مقدار میں جمع ہوتا کہ روزانہ ہر ایک کے حصے میں بمشکل ایک گلاس پانی آتا۔ ان کے گلے پک چکے تھے اور زبانیں سوج گئی تھیں حلیے بگڑ جانے کے باعث وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے سے قاصر تھے اور دن رات کشتی کے اندر بے حس و حرکت پڑے موت کا انتظار کرتے رہتے۔ سُورج طلوع ہوتا اور غروب ہو جاتا، طوفان آتے اور گزر جاتے اور ''پولی'' آہستہ آہستہ انجانی منزل کی طرف بڑھتی رہتی۔

کچے اور نمکین گوشت کے تینوں ڈرم ختم ہو چکے تھے کیپٹن سزینو نے جانسن اور سمیول بیڈگر کو کشتی کی نچلی منزل میں گوشت کے مزید ڈرم لانے کے لئے بھیجا۔ اس نے دل میں کہا ہمارے پاس گوشت کے کافی ڈرم ہیں ہم بھوکے نہیں مر سکتے......

پولی کی نچلی منزل میں تقریباً ۸ فیٹ تک پانی بھرا ہوا تھا۔ سیمول بیڈگر اور جانسن نے دو تین بار غوطے لگا کر گوشت کے ڈرم تلاش کیے، لیکن جب وہ پانی سے ابھرے تو دہشت سے ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''گوشت کے ڈرم سمندر میں ڈوب چکے ہیں۔'' بیڈگر نے مری ہوئی آواز میں کہا، تمام تختے ٹوٹے ہوئے ہیں اور کاٹ کباڑ اور چند فالتو چیزوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔''

یہ سنتے ہی فرطِ غم سے کیپٹن کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ ہم لٹ گئے ساتھیو،

ہمارے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں......''

''گلا سڑا گوشت تک نہیں؟...... بیڈگر نے لمبا سانس لیتے ہوئے کہا۔

یہ صدمہ شدید تھا۔ اگرچہ پانی کی کمی تھی، لیکن بغیر خوراک کے کیسے جیا جاسکتا تھا؟ زندہ رہنے کے تمام موہوم امیدیں ختم ہوگئی تھیں۔ اداس و مغموم تمام لوگ عرشے کے ایک کونے میں بیٹھے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے نہ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کو نا اُمید دیکھ کر کیپٹن سزینو کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ جانتا تھا کہ مصائب کو برداشت کرنے کے لئے ساتھیوں کا حوصلہ بلند رکھنا ضروری ہے، مگر وہ اب کیا کرسکتا ہے...... وہ کس طرح ان کی زندگی کی حفاظت کرسکتا ہے......؟ کوئی کوشش ان حالات کو بدل نہیں سکتی......؟ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تمام مصائب کو چھوڑ کر ہم سب بھوکے پیاسے سکون سے مرجائیں اور نت نئی مصیبتوں سے چھٹکارا مل جائے؟ اسی طرح کے بیسیوں سوال کیپٹن کے ذہن کو پریشان کیے ہوئے تھے، لیکن وہ مجبور تھا۔...... وہ کیا کرے......؟ دھوپ کی بڑھتی ہوئی حدت...... پانی کا معمولی سا ذخیرہ...... خوراک......؟

کیا ہم اسی طرح بھوکے پیاسے مرجائیں گے...... بار بار یہی سوال اس کے سامنے آتا وہ سر جھٹک کر کچھ سوچنے لگا۔

''پولی'' افریقہ کے ساحلی علاقے خلیج سٹریم کے قریب حادثے سے دوچار ہوئی تھی، اور اب خلیج گنیا میں سفر کر رہی تھی، یہ بہاؤ اسے تجارتی جہازوں کے راستے سے آہستہ آہستہ دور لے جا رہا تھا، کیپٹن سزینو عرشے کے کونے میں ایک ٹوٹے ہوئے تختے پر بیٹھا بڑی مایوسی سے اپنے ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا...... کتنے اچھے ہیں یہ ساتھی...... دلیر...... بہادر...... سمندروں کی موجوں سے لڑنے

والے...... جنھوں نے موجوں اور طوفان سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنی زندگیاں گزار دی ہیں اور انتہائی نامساعد حالات میں بھی سینہ سپر رہے ہیں، لیکن آخر انسان کی قوتِ برداشت کی کوئی حد ہوتی ہے...... حیرت ہے کہ ان حالات میں یہ لوگ اب تک زندہ ہیں...... اب تک...... نہیں، یہ نہیں مرسکتے۔ یہ نہیں مرسکتے...... زندہ رہیں گے...... زندہ رہیں گے...... کیپٹن نے قریب بیٹھے ہوئے سیمول بیڈگر کو گلے سے لگالیا...... تم سب زندہ رہو گے......"

کیپٹن سز ینو کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

****

دس دن اور گزر گئے، تمام لوگ بے حس و حرکت عرشے پر پڑے رہتے، اُن کے پھیپھڑے اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ اب آپس میں گفتگو بھی بہت کم کرتے، بھاری بھرکم جانسن ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا۔ ان کی خوراک پانی کے صرف چند گھونٹ تھی۔ کیپٹن سز ینو کو کئی بار محسوس ہوتا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ عرشے پر خاموشی چھائی رہتی، ایک گہری خاموشی...... جسے کبھی کبھی سمندر کی پرشور لہریں توڑ دیتیں۔

ان دس دنوں میں بارش کی امید میں سب کی نظریں آسمان پر لگی رہیں لیکن بارش نہیں ہوئی۔ ایک دن سمندر میں زبردست طوفان آیا۔ مہیب لہریں "پولی" سے ٹکرائیں اور چھاجوں پانی عرشے پر پھینک دیتیں، مگر سب لوگ اس سے بے نیاز مُردوں کی طرح عرشے پر پڑے رہتے طوفان تھمنے کے بعد دھوپ کی حدت غیر معمولی طور پر بڑھ گئی اور ہر ایک کو جسم کی کھال چٹختی ہوئی محسوس ہوئی، سوجی ہوئی زبانیں اور گلے زیادہ تکلیف دینے لگے۔

بھوک اور پیاس کے ہاتھوں نڈھال ہو کر سب نے مچھلیاں پکڑنے

کے متعلق سوچا۔ کشتی میں لگے ہوئے مختلف بانسوں اور لوہے کی چھوٹی چھوٹی کنڈیوں اور سلاخوں کو موڑ توڑ کر مچھلیاں پکڑنے کی کنڈیاں بنائیں اور پٹ سن کی باریک رسیوں سے باندھ کر انہیں سمندر میں اس امید پر لٹکائے رکھا کہ کوئی نہ کوئی مچھلی ضرور پھنس جائے گی، لیکن یہ بھی محض خوش فہمی ثابت ہوئی۔ کیپٹن سز ینو اور بیڈ گر نے مل کر کشتی کی نچلی منزل سے کچھ لکڑی کی تختیاں نکالیں اور پھٹے ہوئے بادبان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو ملا کر دھوپ کی حدت سے بچنے کے لئے ایک چھوٹا سا سایہ بان مکمل کیا۔ معمولی سا کام بھی اب ان کے لئے پہاڑ بن جاتا، وہ اس مصروفیت سے جلد ہی نڈھال ہو کر عرشے پر لیٹ گئے۔

سب کی حالت اتنی غیر ہو چکی تھی کہ ان کے لئے چند قدم چلنا یا کچھ دیر کھڑے رہنا بھی ناممکن تھا۔ وہ عرشے پر کھڑے حسرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے اور سوچتے نہ جانے پہلے کون داغِ مفارقت دے جائے، ان کی کھال ہڈیوں سے چپک گئی تھی، پیٹ کمر سے جا لگے تھے اور زندگی ایک بوجھ محسوس ہونے لگی تھی۔

یہ سفر کا پچاسواں دن تھا۔ آدھی رات کے قریب اچانک پیڈ کاک کی حرکتِ قلب بند ہو گئی۔ حادثے کے بعد یہ پہلی موت تھی جس سے سب کانپ گئے، ان کے چہرے زرد ہو گئے اور ہر شخص پر دہشت طاری ہو گئی، پیڈ کاک سب لوگوں میں غیر معمولی طور پر مضبوط تھا۔ اس کی ساری زندگی سمندروں میں مچھلیوں کا شکار کرتے اور طوفان سے لڑتے گزری تھی۔ پیڈ کاک جیسے قوی ہیکل شخص کی موت نے ان کے دلوں سے زندہ رہنے کی امید چھین لی۔ سب نے مل کر پھٹے ہوئے بادبان کے چھوٹے ٹکڑوں میں پیڈ کاک کی لاش

لپیٹی اور سمندر کی لہروں کے حوالے کر دی۔ اتنے پرانے دوست کے آخری سفر پر سب ملاحوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سمندر میں اونچی اونچی موجیں بھی آپس میں گلے مل مل کر رو رہی تھیں۔ یہ مرحلہ طے ہو جانے کے بعد کیپٹن سز ینو باقی ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

''ساتھیو! پیڈ کاک کی طرح ایک دن ہم سب کو مرنا ہے، اگر ہم کسی نہ کسی کام میں مصروف رہیں تو تکلیف کا احساس کسی نہ کسی حد تک ختم ہو جائے گا۔ ہمیں مچھلیاں پکڑنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیے۔ سایہ بان کو ذرا بڑا بنایا جائے، پانی صاف کرنے کے متعلق کوئی طریقہ سوچنا چاہیے، میں آپ لوگوں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم مصروف رہیں گے تو موت کی اذیت کم ہو جائے گی...... مصروف رہو، خدا پر بھروسہ رکھو اور مردانہ وار اپنی زندگی خدا کے سپرد کر دو''۔

کیپٹن کی باتوں سے ملاحوں کا حوصلہ بلند ہوا اور وہ سایہ بان بنانے اور مچھلیاں پکڑنے کے لئے جدوجہد کرنے لگے، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مچھلیاں پکڑنے کی کوئی کوشش کارگر ثابت نہ ہوئی، البتہ سایہ بان کافی بڑا بن گیا تھا۔

یہ سفر کا چھپنواں دن تھا کہ ڈینیل ہوف بھی اپنے ساتھیوں سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ گیا۔ ڈینیل ہوف کی موت پیڈ کاک سے بھی زیادہ دہشت ناک تھی۔ مرنے سے تقریباً آدھ گھنٹہ پہلے ڈینیل ہوف پر بے ہوشی طاری ہو گئی اور وہ عجیب نا قابلِ فہم الفاظ بڑبڑاتا رہا۔ کبھی وہ زور سے چیختا اور اٹھ کر بیٹھ جاتا اور پھر عرشے پر گر پڑتا۔ مرنے سے چند لمحے پہلے وہ پھر بڑبڑانے لگا۔ اچانک

اس نے ایک زور کی ہچکی لی اور اپنے ساتھیوں کی آنکھوں میں آنسو چھوڑ کر ہمیشہ

کے لئے رخصت ہو گیا۔

ڈینیل ہوف کی لاش بھی پانی میں بہادی گئی، ملاح ایک دوسرے کو خاموش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سبھی ان نظروں کی زبان سمجھتے تھے......

کیپٹن سر ینو ایک طرف کھڑا حسرت بھری نظروں سے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

وہ زندگی سے تقریباً مایوس ہو چکا تھا۔ لیکن اپنے فرائض منصبی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا تھا، وہ جانتا تھا کہ خوراک اور پانی جان بچانے کے لئے ضروری ہیں۔ خوراک تو ہے ہی نہیں اور افق تک پھیلے ہوئے نمکین پانی کے سوا پینے کا پانی ایک قطرہ بھی نہیں مل سکتا۔ آسمان پر سورج پوری تمازت سے چمک رہا تھا اور دُور دُور تک بارش کے کوئی آثار نہ تھے۔ یہ جانتے ہوئے کہ کشتی کی نچلی منزل میں کچھ بھی نہیں کیپٹن سرینو نیچے اتر گیا اور پانی میں غوطہ لگا کر ادھر اُدھر ہاتھ مارتا رہا۔ ایک کونے میں اس کے پاؤں سے کوئی سخت چیز ٹکرائی۔ پے در پے دو تین غوطے لگا کر جب وہ ابھرا تو کباڑ سے کیتلی اور ایک پستول حاصل کر چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا عرشے کے ایک کونے میں گیا اور دونوں چیزوں کو سامنے رکھ کر بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کس طرح انہیں کام میں لایا جا سکتا ہے۔

آخر اسے ایک تدبیر سوجھی۔ اس نے قریب ہی پڑی ہوئی لوہے کی بالٹی اٹھائی اور کیتلی کو اس میں الٹا رکھ دیا۔ لیکن کیتلی کا منہ بالٹی کے پیندے میں اچھی طرح پیوست نہیں ہو رہا تھا۔ کیپٹن نے چاقو نکال کر کیتلی کے منہ کا موٹا حصہ کاٹنا شروع کیا اور کئی گھنٹے کے بعد وہ کیتلی کا منہ حسبِ خواہش کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بالٹی کے پیندے

اور کیتلی کے منہ سے پیدا ہونے والے جوڑ پر اچھی طرح لپیٹ دیے۔تا کہ تھوڑا تھوڑا پانی اس میں سے جذب ہو کر کیتلی کے اندرونی حصے میں جا سکے۔اس کے بعد کیپٹن سز ینو نے پستول کا پرزہ پرزہ الگ کر دیا اور پستول کی نالی کو کیتلی کے پیندے میں فٹ کر کے نالی کا اوپری سرا کپڑے سے اچھی طرح بند کر دیا اس طرح وہ سمندر کے نمکین پانی کو کشید کرنے کے لئے چھوٹا سا آلہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے ملاحوں کو جب اس ایجاد کا علم ہوا تو خوشی سے ان کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے چمک اٹھیں۔ بیڈ گر نے خوشی اور حیرانی کے ملے جلے جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

……کیپٹن، واقعی یہ ایک معجزہ ہے……کیا تمہیں یقین ہے کہ آلہ ٹھیک کام کرے گا؟

"بے شک" سز ینو نے نرمی سے جواب دیا۔اس نے بڑی احتیاط سے آلے کو آگ پر رکھا اور چند خشک لکڑیاں بالٹی کے پیندے کے نیچے جلا دیں چند لمحے بعد کیتلی کی نالی سے بھاپ نکلنے لگی۔کیپٹن نے کیتلی کے الٹے حصے پر ٹھنڈا پانی ڈالنا شروع کیا۔ جب کیتلی کی نالی سے قطرہ قطرہ پانی نیچے رکھے ہوئے برتن میں ٹپکنے لگا تو سب ملاحوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ان کی خوشی نا قابل برداشت تھی۔

نالی سے قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا رہا، سب ملاح دن رات کشتی کے چھجے کو توڑ کر لکڑیوں سے آگ جلاتے رہے اور اس قیمتی پانی کو جمع کرتے رہے اور پھر انہوں نے اتنا پانی اکٹھا کر لیا کہ ہر آدمی دن بھر میں کم از کم ایک گلاس پانی پی سکتا تھا۔

صاف پانی کشید کرنے کے آلے کی ایجاد سے سب کے دلوں میں

ایک بار پھر زندہ رہنے کی موہوم امید پیدا ہوئی، قدرت ان پر مہربان ہو رہی تھی۔ دوسرے دن بیڈگر نے عرشے کے کونے میں پڑی ہوئی رسی کے گچھے کو کھولا اور بہت دیر تک بیٹھا اس کا جال بنتا رہا۔ تین گھنٹے میں دو گز مربع جال تیار ہو چکا تھا۔ بیڈگر نے ایک لمبی اور مضبوط رسی کو جال کے کونوں سے باندھ کر سمندر میں لٹکا دیا۔ قدرت جب مدد کرنا چاہے تو ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ سمندر میں جال پھینکے ابھی آدھ گھنٹہ نہ گزرا تھا کہ اس میں ایک بڑی سی شارک مچھلی پھنس گئی۔ جس کا گوشت بھون کر سب لوگ کئی دن تک اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے رہے۔ اگرچہ معمولی مقدار میں مچھلی کا گوشت اور پانی میسر تھا، لیکن پھر بھی وہ روز بروز کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی حدت، ناکافی غذا، رات کی ٹھنڈ، سمندری طوفان اور ہوا میں ان کی صحت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی دن تک کوئی مچھلی جال میں نہ پھنستی اور انہیں بھوکا رہنا پڑتا۔

۱۵ مارچ کے دن "پولی" کو بحر اوقیانوس میں بھٹکتے ہوئے پورے تین مہینے گزر چکے تھے، اور اسی دوپہر ہندوستانی خانساماں ماہو بھی اپنے ساتھیوں کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔ کیپٹن سز بینو نے خاص طور پر اپنی ڈائری میں ماہو کا ذکر ان الفاظ میں کیا۔

"۱۵ مارچ ۱۸۱۲ء۔ آج ہندوستان کا رہنے والا ماہو بھی ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا ہے۔ ماہو نے اپنے ساتھیوں کے لئے نہایت نامساعد حالات میں آگ جلا کر جو کام کیا ہم سب اس کی قدر کرتے ہیں۔ ہمیں آج بحر اوقیانوس کے

پانی پر بھٹکتے ہوئے پورے تین مہینے بیت گئے ہیں۔ ہمارے
تین ساتھی ہم سے جدا ہو گئے ہیں۔ جن کا مجھے افسوس ہے۔
ہم نہیں جانتے ہماری منزل کون سی ہے اور خدا کے سوا کون
جانتا ہے کہ ہم زندہ بھی رہیں گے یا اس تباہ شدہ کشتی کے
عرشے پر ہماری لاشیں گلتی سڑتی رہیں گی۔

****

''ہم بھوک کے مر رہے ہیں، بیڈگر نے ماہو کی لاش دیکھتے ہوئے طویل خاموشی توڑی۔

''کیپٹن...... شاید...... شاید تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔ یعنی...... میرا مطلب ہے...... ہم ماہو کی لاش کو......'' الفاظ بیڈگر کے حلق میں اٹک گئے''

''بیڈگر''؟ کیپٹن دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے چیخا، یہ نہیں ہو سکتا...... یہ نہیں ہو سکتا...... کبھی نہیں...... ہم مر جائیں گے لیکن مردم خوری نہیں کریں گے۔

کافی بحث کے بعد آخر وہ اس بات پر متفق ہو گئے کہ ماہو کی لاش کو لہروں کے سپرد کرنے سے پہلے اس کی بائیں ٹانگ کاٹ لی جائے۔ انہوں نے اس گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور مچھلیاں پکڑنے کے کانٹوں میں پھنسا دیے۔ انسانی گوشت کی بو پر کچھ دیر بعد ہی ایک شارک مچھلی جال میں پھنس گئی، جس کا گوشت وہ تقریباً ایک ہفتے تک پیٹ بھر کر کھاتے رہے۔ اس دوران میں ایک بار پھر دوبارہ کشتی کی نچلی منزل کا کونا کونا چھانا گیا۔ پھر ایک پستول ان کے ہاتھ لگا۔ کیپٹن نے پستول کی نالی الگ کی اور اسے کیتلی

کے پینڈے میں فٹ کردیا۔ اس طرح پانی کی سپلائی دگنی ہوگئی اس کے علاوہ انہوں نے احتیاطاً ٹین کے خالی ڈبوں اور پیپوں کو بھی عرشے پر کئی جگہ رکھدیا۔ تاکہ بارش ہونے پر زیادہ سے زیادہ پانی محفوظ ہو سکے۔

اپریل کا مہینہ دنیا کے لئے بہار کا پیغام لے کر آیا، لیکن "پولی" کشتی کے عرشے پر پڑے ہوئے ان چاروں انسانی ڈھانچوں کے لئے وہی بدقسمتی تھی، جو شاید ان کا مقدر بن چکی تھی۔ وہ اب بھی ایک نامعلوم منزل کی طرف رواں تھے۔ چند دنوں بعد ایک شام جانسن پر بے ہوشی طاری ہوئی اور چند ہی لمحے میں وہ اپنے ساتھیوں سے بہت دور پہنچ گیا۔

"پولی" میں صرف تین زندہ لاشیں عرشے پر پڑی ہوئی آنکھوں میں ایک حسرت لئے آسمان کی طرف تک رہی تھیں، کیپٹن سز ینو...... بیڈگر اور سویڈن کا رہنے والا ایک ملاح، اپریل کی آخری ہفتے کا ذکر ہے۔ ایک دن صبح جب ان کی آنکھیں کھلیں تو یہ دیکھ کر ان کی حیرانی کی حد نہ رہی کہ کشتی اپنی جگہ کھڑی ہے اور معمولی حرکت بھی نہیں کر رہی ۔ سمندر میں چاروں طرف سمندری گھاس اور کائی پھیلی ہوئی تھی۔

"خطہء سارگاسو" کیپٹن کے منہ سے چیخ نکل گئی۔

"شاید "پولی" اب کبھی نہ تیر سکے۔ ہماری موت کھینچ کر خطہء سارگاسو میں لے آئی ہے۔ سمندری خودرو گھاس اور کائی کی اتنی موٹی تہہ سمندر پر جمی ہے کہ کشتی ایک گز بھی نہیں تیر سکتی...... اے خدا...... کیپٹن سز ینو نے آسمان کی طرف دیکھا۔

"پولی" خطہء سارگاسو میں کھڑی تھی، اس خطے کا نام سنتے ہی بڑے بڑے تجربہ کار ملاح اور بہادر جہازران کانپ اٹھتے تھے۔ یہاں سال کے بارہ

بہنے خودرو گھاس اور کائی کی موٹی موٹی تہہ جمی رہتی ہے اور کئی کئی میل تک پانی کے گرداب نظر آتے ہیں، جن کی وجہ سے کائی اور خودرو گھاس کی تہیں پھٹنے کے بعد دوبارہ آپس میں مل جاتی ہیں۔ جتنے بھی بدقسمت جہاز یہاں آن پھنسے، وہ کبھی واپس نہیں جا سکے اور میلوں پھیلے ہوئے بھنور کے چکروں میں پھنس کر سمندر کی تہہ میں بیٹھ گئے ''پولی'' کشتی کے مستول تھے نہ بادبان، ایسی صورت میں کشتی کو یہاں سے نکالنے کی کوئی بھی تدبیر کارگر نہ ہو سکتی تھی۔

بیڈگر نے مایوسی سے کہا۔ ''ہم چار مہینے تک موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا رہ چکے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اب ہمارا آخری وقت قریب ہے''

''بے شک زندہ بچ نکلنے کا کوئی امکان نہیں۔ سویڈن کے ملاح نے تصدیق کی۔

کیپٹن سزینو کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ تم حوصلہ ہار رہے ہو، ہم اتنا پُر از مصائب اور طویل سفر طے کرنے کے بعد بھی زندہ ہیں۔ ہمارے پاس پینے کا صاف پانی ہے اور خوراک بھی مل ہی جاتی ہے۔ خدا پر بھروسا رکھو۔ کیا تمہیں امید نہیں کہ خطۂ سارگاسو ہمیں تباہ کرنے کے بجائے ہمارے لئے مددگار بھی ثابت ہو سکتا ہے۔

دونوں ملاح کیپٹن سزینو کے چہرے کو غور سے دیکھ رہے تھے، انہیں یوں محسوس ہوا جیسے کیپٹن چند لمحوں کا مہمان ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ ہونٹوں پر پپڑی جم گئی ہے اور چند لمحے بعد ان کی آنکھوں کے سامنے وہی منظر ہوگا۔ جسے ان کی آنکھیں چار مرتبہ دیکھ چکی ہیں...... بے ہوشی...... چیخیں...... ہچکیاں...... موت......

وہ دونوں کیپٹن کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے رہے۔ کیپٹن سمندر میں

بالٹی لٹکا رہا تھا۔ پانی بھرنے کے بعد اس نے بالٹی اوپر کھینچی اور عرشے پر بالٹی رکھتے ہوئے وہ چیخا، دیکھو، ساتھیو دیکھو، کائی میں لپٹے ہوئے جنگلی سیب، جنگلی سیب ادھر دیکھو، کیپٹن نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سینکڑوں ، ہزاروں، لاکھوں جنگلی سیب...... ہم نہیں مر سکتے...... ہم نہیں مر سکتے...... بیڈگر ہم زندہ رہیں گے...... ہم زندہ رہیں گے......''

بیڈگر اور دوسرے ملاحوں نے سمندر کی سطح کو غور سے دیکھا۔ ہزاروں جنگلی سیب کائی میں پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ خطۂ سارگاسو کے پُرسکون پانی پر قدرت نے انہیں اتنی خوراک مہیا کر دی تھی، جو ایک فوج کے لئے بھی کافی تھی۔

کیپٹن سز ینو اور دوسرے ملاح تمام دن بالٹیوں میں جنگلی سیب جمع کرتے اور عرشے پر ڈھیر لگاتے رہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے سمندر میں جال پھینک کر کئی رنگ برنگی مچھلیاں بھی پکڑیں ان کے ٹکڑے کئے اور نمک لگا کر دھوپ میں سکھانے لگے۔

وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ صبح ہوتی، سورج چمکتا، پھر شام کے سائے گہرے ہو جاتے اور تاریک رات چھا جاتی، ''پولی'' اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ پانی کشید کرنا جنگلی سیب جمع کرنا اور مچھلیاں پکڑ کر سکھانا ان کا معمول بن گیا۔ وہ اپنے ماحول سے بے نیاز کام میں لگے رہتے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اسی کشتی میں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں زندگی گزر جائے گی۔ بعض اوقات تو انہیں خشکی تک پہنچنے کا خیال بھی نہ آتا۔ اب تو خطہ سارگاسو ہی ان کی دنیا بن چکا تھا۔ جہاں حد نظر تک کائی خودرو گھاس اور پانی پھیلا ہوا تھا اور اوپر نیلے آسمان کی وسعتیں...... اب خوراک اور پانی کی کوئی کمی نہ تھی۔ لیکن ان

کا تیسرا ساتھی سویڈن کا رہنے والا ملاح، روز بروز کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ اسے سانس لیتے ہوئے سینے میں شدید درد محسوس ہوتا اور آخر ایک شام، جب اندھیرا گہرا ہو رہا تھا، اس نے آخری ہچکی لی اور ''پولی'' کشتی پر اپنے دونوں ساتھیوں کو مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے چھوڑ کر اگلے جہان روانہ ہو گیا۔ مرنے کے بعد اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور یوں نظر آتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کو اب بھی خشکی پر پہنچ جانے کا انتظار ہے۔

اب صرف کیپٹن سزینو اور ملاح سیمول بیڈگر باقی رہ گئے تھے۔ وہ دونوں تمام دن کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے۔ مچھلیاں پکڑ کر دھوپ میں سکھاتے، پانی کشید کرتے اور سایہ بان کو بڑا بناتے رہتے۔ حالانکہ سایہ بان کے نیچے بیٹھنے والے ساتھی ان سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ چکے تھے۔ لیکن اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے وہ کام کرتے اور آخر تھک کر سو جاتے۔

ایک دن صبح وہ دونوں یوں ہی عرشے پر کھڑے دور تک پھیلے ہوئے سمندر کو دیکھ رہے تھے چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھ رہی تھیں، جن سے کہیں کہیں خود رو گھاس اور کائی کی تہہ پھٹ رہی تھی، انہوں نے خوشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا انہیں امید بندھ گئی کہ اب جلد ہی ''پولی'' خطہ سارگاسو کی قید سے رہا ہو کر کھلے سمندر میں پہنچ جائے گی۔ ''پولی'' آہستہ آہستہ تیرنے لگی۔ کائی کے بڑے بڑے ٹکڑے دور دور تک بہہ رہے تھے۔

''ہم سارگاسو کی قید سے آزاد ہو گئے ہیں۔'' بیڈگر نے خوشی سے کہا۔

''لیکن ہم جنگلی سیبوں جیسی شیریں خوراک سے بھی تو محروم ہو گئے ہیں۔ کیپٹن سزینو کی چہرے پر پریشانی عیاں تھی۔ اس نے پانی پر بہتے ہوئے ہزاروں جنگلی سیبوں پر نظر ڈالی اور کہا۔

''یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے لئے سارگاسو کی قید بہتر تھی، یا کھلے سمندر میں کشتی کا تیرنا بہتر ہے، جہاں خوراک ملنے کا امکان کم ہی ہے۔

''ہمارے پاس کافی جنگلی سیب اور سوکھی مچھلیاں ہیں۔ بیڈ گر نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ کیپٹن سز ینو نے مایوسی سے سر ہلایا۔

''بیڈ گر! آخر یہ جنگلی سیب اور سوکھی مچھلیاں کب تک ساتھ دیں گی؟ ان کے سہارے ہم اس سمندر میں کب تک زندہ رہیں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم تجارتی جہازوں کے راستے پر ہیں۔ شاید ہم راس امید اور انگریزی بندرگاہوں کے درمیان کسی جگہ سفر کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کوئی گزرتا ہوا جہاز ہمیں دیکھ لے''۔

****

جون کا پہلا ہفتہ تھا، وہ دونوں تمام دن عرشے پر کھڑے افق پر نظریں گاڑے کسی جہاز کو تلاش کرتے۔ ایک دن انہوں نے بہت دور چند جہاز دیکھے، لیکن 'پولی' کا کوئی بادبان تھا اور نہ مستول، جسے دیکھ کر جہاز مدد کو پہنچتا۔ یہ جہاز بھی گزر گئے۔ زندگی کا دامن ایک بار پھر ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

۱۹ جون تک ''پولی'' اپنے جائے حادثہ سے تقریباً ۲ ہزار میل دور جزیرہ کیزے کے قریب سرگرم سفر تھی۔ اس حساب سے ''پولی'' نے ایک مہینے میں تین سو میل طے کئے اور ایک دن میں صرف دس میل۔ چھ مہینے گزر چکے تھے اور عملے کے سات آدمیوں میں سے صرف دو ایڑیاں رگڑنے کے لئے باقی تھے۔

۲۰ جون کی صبح حسبِ معمول طلوع ہوئی کیپٹن سز ینو کی نظریں کسی جہاز کی تلاش میں افق پر لگی ہوئی تھیں اور پھر جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں

آ رہا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تین جہاز رواں تھے جن کے مستول پر سرخ اور نیلے برطانوی جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

"جہاز...... تین برطانوی جہاز...... کیپٹن سز ینوخوشی سے چیخا۔

جہازوں کو دیکھتے ہی بیڈگر کی حالت ایک دم تبدیل ہوگئی۔ وہ کیپٹن کے قریب کھڑا اپنے دونوں بازو اوپر اٹھا کر پوری قوت سے چیخنے لگا۔ کیپٹن سز ینو بھی چیخ چیخ کر تھک گیا تھا۔ کمزوری کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا اور وہ عرشے کے ٹوٹے ہوئے تختے کا سہارا لیتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونج رہی تھیں اور ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں ان کی منزل قریب آ رہی تھی، فرطِ جذبات سے انہیں کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔

تینوں جہاز نزدیک پہنچ گئے ان کے اوپر بلاشبہ برطانوی جھنڈے لہرا رہے تھے کیپٹن سز ینو اور بیڈگر کے دل دھڑک اٹھے اور وہ دیوانوں کی طرح جہازوں کو دیکھنے لگے۔ برطانوی جہاز "فیم" کے عرشے پر کھڑے ہوئے کیپٹن فیدرسٹون نے اشارہ کیا، لیکن کیپٹن سز ینو پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ چند لمحے غور سے کیپٹن فیدرسٹون کو دیکھتا رہا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ کیپٹن سز ینو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ خوشی کے آنسو، تشکر کے آنسو۔

ایک چھوٹی سی کشتی "فیم" جہاز سے اتاری گئی اور جلد ہی کیپٹن سز ینو اور بیڈگر "فیم" جہاز پر پہنچ گئے۔ "پولی" کو چھوڑتے ہوئے سز ینو نے چند لمحے غور سے عرشے کو دیکھا اور پھر چھوٹی کشتی پر سوار ہوگیا اور "فیم" جہاز کی طرف

دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور اس کی ڈاڑھی میں جذب ہو گئے۔

کیپٹن سز ینو کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بچھڑے ہوئے ساتھی اصل میں آج ہی اس سے جدا ہوئے ہیں۔

****

فیدر سٹون نے فوراً گرم پانی کا انتظام کروایا۔ نہانے دھونے اور کپڑے بدلنے کے بعد آج سز ینو نے چھ مہینے بعد بیڈ گر کے ساتھ مل کر لذیز اور تازہ کھانا کھایا۔ اسے رہ رہ کر اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی یاد آنے لگے۔

کیپٹن فیدر سٹون نے رات کے وقت تینوں کپتانوں کے اعزاز میں دعوت دی۔ بہت دیر تک برطانوی جہازوں کے کیپٹن، سز ینو اور بیڈ گر سے دل دہلا دینے والے واقعات سنتے رہے۔ اپنے ساتھیوں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے کئی دفعہ سز ینو کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔

چند دنوں بعد کیپٹن سز ینو اور بیڈ گر کو "ڈرومو" نامی کشتی کے ذریعے واپس بوسٹن بھیج دیا گیا۔ گھر پہنچنے پر ان کا شاندار استقبال ہوا۔ بوسٹن پہنچنے پر انہیں معلوم ہوا کہ "پولی" کے متعلق یہ خبر عام مشہور ہو چکی تھی کہ وہ گم ہے اور خیال ہے کہ ڈوب چکا ہے۔

"پولی" کے دو ہزار میل طویل سفر اور کیپٹن سز ینو اور بیڈ گر کا بچ جانا، ان دونوں بوسٹن کی کئی بندرگاہوں پر گفتگو کا عام موضوع بنا رہا۔ ان ہی دنوں کیپٹن سز ینو اور سیمول بیڈ گر دوبارہ ایک پرائیوٹ جہاز میں ملازم ہو گئے۔

جس وقت کیپٹن سز ینو اور سیمول بیڈ گر کو بچایا گیا اس وقت "پولی"

افریقہ کے مغربی ساحل سے تھوڑی فاصلے پر ۲۸ درجہ عرض البلد اور ۱۳۰ درجہ طول بلد پر سفر کر رہی تھی۔ لیکن اسے دوبارہ تجارتی جہازوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بے شک "پولی" کی آخری منزل سمندر کی اتھاہ گہرائی ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے چھ ماہ تک طوفان سے لڑنے والی "پولی" کبھی نہ ڈوبے اور کسی دن سمندر کی زبردست موجوں کے تھپیڑے کھاتی ہوئی براعظم افریقہ کے ساحل پر آ لگے۔

☆☆☆

چوہوں کی دیواریں

(مقبول جہانگیر)

وہ میری زندگی کا انتہائی منحوس، لیکن ناقابل فراموش دن تھا کہ میں اپنے آبائی محل ایکس ہام میں داخل ہوا۔

جولائی کی ۱۶ تاریخ تھی اور زمانہ آج سے چوالیس سال پہلے کا، محل کی مرمت گزشتہ کئی ماہ سے ہو رہی تھی اور یہ وہ دن تھا کہ آخری مزدور بھی کام ختم کر کے جاچکا تھا۔ ایکس ہام محل گزشتہ کئی صدیوں سے خالی اور ویران پڑا تھا۔ غالباً جیمز اول کے دور سے، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک روز میرے خاندان کے چند افراد پُر اسرار حالت میں مردہ پائے گئے تھے، روایت یہ تھی کہ انہیں کسی شخص نے تیز دھار آلے کی مدد سے قتل کیا ہے اور پھر لاشوں کو اس بُری طرح نوچا اور جھنجھوڑا جیسے بلی، چوہے کو نوچتی اور جھنجھوڑتی ہے۔

ایکس ہام محل کے بارے میں عوام کے اندر طرح طرح کی لرزہ خیز کہانیاں اور داستانیں مشہور تھیں، اور جو ہمارے خاندان میں بھی سینہ بہ سینہ ایک سے دوسرے کو منتقل ہوئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا کا پردادا جو گیارہویں بیرن کے نام سے مشہور تھا، ان داستانوں کا اصل سبب بنا، اس نے نامعلوم جنون کے تحت پہلے اپنے تمام خادموں کو قتل کیا۔ پھر بیوی اور پانچ بچوں کو ہلاک کیا اور ورجینا کی طرف بھاگ گیا جہاں ہمارے خاندان کے کچھ اور افراد بھی رہتے تھے۔ اس کے بعد پتہ نہیں چل سکا کہ گیارہویں بیرن کا کیا حشر ہوا اور وہ ورجینیا سے کہاں گیا...... ایکس ہام محل جیسی عظیم الشان عمارت یوں یکایک چھوڑ دینا جس میں دولت کے بے شمار انبار نوادر کی شکل میں جمع تھے اور اپنے بیوی بچوں اور خادموں کو وحشیانہ انداز سے قتل کر دینا، صحیح الدماغ آدمی کا کام نہیں ہوسکتا۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ بیرن کو کالے علم سے بڑی

دلچسپی تھی اور بالآخر اسی علم کے باعث ایکس ہام کے مکینوں پر یہ آفت ٹوٹی۔

یہ عظیم الشان محل جو صدیوں پرانا تھا اور گاتھک، سیکسن اور رومیوں کے عظیم فنِ تعمیر کا نادر روزگار نمونہ، اس مشہور واقعے کے بعد بالکل خالی پڑا رہا۔ اس کا وسیع و عریض باغ اجڑ گیا۔ بڑے بڑے کمروں کی دیواریں اور فرش گردوغبار سے اَٹ گئے، جگہ جگہ مکڑیوں نے مہیب جالے تن دیے اور ہزار ہا چمگادڑیں اس کے اندھیرے برآمدوں اور لمبی راہداریوں میں لٹکی رہنے لگیں۔ لوہے اور لکڑی کے بنے ہوئے بلند دروازے کھڑکیاں اور ان پر لٹکے ہوئے بھاری پردے سب بوسیدہ ہو گئے۔ لیکن گرے نہیں، چپے چپے پر اونچی گھاس اور خاردار پودوں نے جنم لیا اور آہستہ آہستہ ایکس ہام کی پُرشکوہ اور شاندار عمارت اس ویرانی اور ہولناک سناٹے کے اندر پوشیدہ ہو گئی اور صدیوں تک پوشیدہ رہی۔

چونکہ ایکس ہام محل کا مالک قتل جیسی بھیانک واردات کر کے بھاگا تھا، اس لئے اس کی جائیداد شاہی حکم کے تحت ضبط کر لی گئی اور چونکہ بیرن کی طرف سے مقدمہ لڑنے والا کوئی شخص انگلینڈ میں نہ تھا اس لئے عرصہ دراز تک اس عمارت کے دروازوں اور کمروں پر قفل چڑھے رہے۔ آخر نوریز فیملی کے ایک مقتدر رکن نے جس کا اُمراء پر خاصا اثر تھا۔ خاصی خطیر رقم کے عوض یہ محل حکومت سے خرید لیا اور اپنی فیملی سمیت یہاں آن بسا، مگر اسے ایک ماہ رہنا بھی نصیب نہ ہوا۔ روایت یہ ہے کہ ایک روز وہ بھی اپنے خاندان کے تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار کر غائب ہوا کہ آج تک اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ اس دوسرے حادثے کے بعد ہی تمام ملک میں ایکس ہام کے بارے میں عجیب عجیب کہانیاں مشہور ہوئیں اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ کالا علم جاننے والے بیرن کی روح اس میں رہتی ہے اور وہ کسی بھی شخص کو جو محل کے اندر قدم رکھے گا جیتا نہ چھوڑے گا۔

بعض مہم پسند اور خطروں سے کھیلنے والے لوگوں نے ایکس ہام میں جانے اور

رہنے کی کوشش بھی کی اور ان کہانیوں کے بارے میں تحقیق و تفتیش بھی کی، لیکن کوئی قابلِ ذکر نتیجہ برآمد نہ ہوا، تاہم وہ شخص جو بھی زمانہ قدیم میں اس محل کے اندر گیا، اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ یہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔

قصبہ انچسٹر کے مغرب میں تین میل کے فاصلے پر چونے، لوہے، لکڑی اور پتھر کی بنی ہوئی اس قدر قدیم اور پُرشکوہ عمارت کو دیکھنے کے لئے دنیا بھر کے ماہرین تعمیرات آتے رہتے تھے اور اسی وجہ سے اس کی شہرت انگلستان میں اور دوسرے یورپین ملکوں میں عام تھی۔ لیکن میں اس سے بالکل بے خبر رہا، شاید اس لئے کہ کئی پشتوں پہلے ہمارا خاندان انگلستان سے نکل کر امریکا میں جا بسا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے میں سات سال کا تھا کہ ایک روز دادا نے کھانے کی میز پر ایکس ہام محل کا ذکر کیا اور میرے والد کو بتایا کہ وہ تاریخی عمارت ہماری ملکیت رہی ہے۔ انہوں نے ایک وصیت نامے کا ذکر بھی کیا جو لفافے میں بند تھا اور میرے پر دادا کے پاس حفاظت سے رکھا تھا۔ وہ کبھی کبھی اسے تنہائی میں کھول کر دیکھا کرتے اور کچھ سوچتے، لیکن انہوں نے اپنے بیٹے کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتایا کہ اس میں کیا لکھا ہے، ان دنوں وہ کار فیکس میں رہتے تھے اور سول وار کا دور تھا۔ اچانک ایک روز مکان میں آگ لگی اور سب کچھ جل گیا۔ میرے پر دادا بھی اسی آگ میں جل مرے اور پھر وہ بڑا سا لفافہ کسی نے نہ دیکھا۔ میرے دادا کار فیکس سے اپنے خاندان کو لے کر میساچوسٹس چلے آئے اور ان کا انتقال وہیں ہوا۔ میرے والد ان دنوں فوج میں تھے اور زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہتے تھے۔ اس لئے ایکس ہام کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں مل سکیں۔ اور نہ وہ وقت ایسا تھا کہ میں ان سے کچھ پوچھ سکتا۔

۱۹۰۴ء میں میرے والد نے وفات پائی، مرنے سے تھوڑی دیر پہلے تک وہ پورے ہوش و حواس میں تھے۔ خاندان کے سبھی افراد ان کے پاس موجود تھے۔ والد نے زندگی کے آخری سانس لیتے ہوئے اپنی انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور

بولے۔

ایکس ہام ..... نوریز فیملی سے واپس لے لو..... وہ ہمارا ہے ..... یہ کہتے ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔

چند روز تک تو ان کے یہ پُر اسرار الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے، پھر میں انہیں بھول گیا، کیوں کہ اپنے کاروبار میں اس قدر پھنسا ہوا تھا کہ کسی اور طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ تھی۔ انہی دنوں میری بیوی بھی دنیا سے رخصت ہوئی اور دس سال کے اکلوتے لڑکے الفرڈ کی پرورش اور تربیت کی ذمے داری میرے ہی کندھوں پر آن پڑی۔

الفرڈ نہایت سمجھ دار اور ذہین بچہ تھا اور ہمیشہ مجھ سے اپنے خاندان کے بزرگوں کے حالات پوچھا کرتا، مجھے کچھ معلوم ہوتا، تو بتاتا؟ تاہم چند موٹی موٹی باتیں میں نے اسے بتائیں۔ اسے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہم کوئی ایرے غیرے نہیں، بلکہ انگلستان کے قدیم معزز اور امیر خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور انچسٹر کی مشہور عمارت ایکس ہام کی اصل مالک بھی ہم ہی ہیں۔ الفرڈ کو میں نے اس کی ضد اور شدید شوق کے پیش نظر انگلستان بھیجا اور ہوابازی کی تربیت دینے والے ایک سکول میں داخل کرا دیا۔ اس نے بہت جلد تربیت ختم کی اور ہواباز بن گیا۔ وہ برابر مجھے خط لکھتا اور ہر خط میں کوئی نہ کوئی نئی دریافت اپنے خاندان سے سے متعلق ضرور ہوتی۔ رائل فلائنگ کارپس کا ایک کیپٹن ایڈورڈ نوریز اس کا دوست بن گیا تھا اور جب کیپٹن نوریز نے اسے بتایا کہ ایکس ہام کا قدیم محل ابھی تک انہی کے قبضے میں چلا آتا ہے، تو الفرڈ مزید صبر وضبط سے کام نہ لے سکا اور اس نے ایک خط میں اپنے دادا کی وصیت کے الفاظ لکھے اور زور دیا کہ ایکس ہام محل نوریز فیملی سے واپس خرید لیا جائے۔ وہ اسے فروخت کرنے کے لئے بھی بخوشی آمادہ ہیں۔ اس میں کوئی شخص گزشتہ تین سو برس سے نہیں رہا۔ کیوں کہ عمارت بدنام ہو چکی ہے اور اس کے بارے میں انچسٹر کا ہر فرد وبشر

کہتا ہے کہ یہ آسیب زدہ ہے۔

کیپٹن نوریز نے میرے لڑکے کو ایکس ہام کی چند لرزہ خیز کہانیاں سنائیں جن کے بارے میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ غلط ہوں گی۔ جب سے اس فیملی نے یہ عمارت خریدی تھی، اسی وقت سے ان پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہوتی رہی، حتیٰ کہ ان لوگوں نے آپس میں ہی ایک دوسرے کے گلے کاٹنے شروع کر دیئے آخر وہ سب کے سب یہاں سے نکل گئے اور انچسٹر کے دوسرے مکانوں میں جا بسے۔

الفرڈ کے بار بار کے تقاضوں سے تنگ آ کر آخر میں نے ایکس ہام کو خریدنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت کیپٹن نوریز کا حقیقی چچا اس کا مالک تھا اور اپنی عمر کے اسی برس طے کر چکا تھا۔ انتہائی نفرت اور حقارت کے ساتھ اس خبیث بڈھے نے مجھے دیکھا اور آپ ہی آپ کچھ بڑبڑانے لگا۔ کیپٹن نوریز نے اس کی طرف سے معذرت کی اور ایکس ہام کو بیچنے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر کی تمام کاغذات مکمل کرائے اور یوں یہ عمارت صدیوں بعد دوبارہ ہمارے خاندان کے قبضے میں آ گئی۔ الفرڈ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس نے جوش میں آ کر کہا۔

''ابا، تم دیکھنا، میں اس محل کی کیسی عمدہ مرمت کراتا ہوں...... بڑے بڑے لوگ آئیں گے اور حیرت سے دانتوں میں انگلیاں دے لیں گے۔ غضب خدا کا ہم کوئی معمولی آدمی ہیں...... ہم ڈی...... لا...... پورز ہیں...... جس کے خاندان کا ہر شخص بیرن ہے بیرن''۔

مجھے اپنے کاروبار کے سلسلے میں انہی دنوں امریکہ واپس جانا پڑا اور پہلی جنگ عظیم چھڑ گئی، دو سال تک مجھے اپنے لڑکے کا کوئی خط نہ ملا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ البتہ ایک دو مرتبہ کیپٹن نوریز کا خط آیا جس سے معلوم ہوا کہ الفرڈ بخیریت ہے اور جنگ ختم ہونے کے بعد جب میں اپنے الفرڈ کو دیکھنے انگلستان گیا، تو وہ اپنی دونوں ٹانگیں کھو چکا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر کلیجہ بیٹھ گیا اور قریب تھا میرے دل کی

حرکت بند ہو جائے کہ اس نے انتہائی استقلال اور حوصلے سے کہا۔

''ابا، اس میں گھبرانے یا رونے کی کیا بات ہے۔ میں نے ایک نیک مقصد اور وطن کی حفاظت کا فرض انجام دیتے ہوئے ٹانگیں کھوئی ہیں...... خدا کو یہی منظور تھا...... اب میں کچھ زیادہ دن نہ جیوں گا۔ لیکن مرنے سے پہلے ایکس ہام کو اپنی اصلی حالت میں ضرور دیکھنا چاہتا ہوں...... پیارے ابا، آپ میری یہ خواہش پوری نہ کریں گے؟''

میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے، میں نے بے اختیار اسے لپٹا لیا اور بولا۔

''بیٹا، میری یہ تمام دولت آخر ہے کس کی...... یہ سب کچھ تمہارے ہی لئے ہے۔ میں بہت جلد ایکس ہام کی مرمت کراؤں گا اور خدا نے چاہا، تو آئندہ موسم سرما تک ہم امریکہ سے آکر اس میں آباد ہو جائیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ مکان آسیب زدہ ہے۔ لیکن میں ان آسیبوں اور بھوتوں پر یقین نہیں رکھتا، ویسے بھی کیپٹن نوریز کا خیال ہے کہ لوگوں نے خواہ مخواہ کی کہانیاں بنا رکھی ہیں۔ اگر کسی انسان، نے اس عمارت کے اندر کسی کا خون بہایا ہے یا کسی کو قتل کیا، تو اس کی وجہ بدروحیں یا آسیب نہیں ہو سکتے''

میرے ان جملوں پر الفرڈ کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکنے لگیں۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد میں تمام کاروبار اپنے حصے داروں کے سپرد کر کے انگلستان آ گیا اور انچسٹر ہی میں ایک مکان کرایے پر لے کر رہنے لگا۔ میں نے بہت جلد محسوس کر لیا ہے کہ اس قصبے کے لوگ ہمیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اور دور دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابتدا میں خیال آیا شاید دو چار روز میں گھل مل جائیں اور چوں کہ ہم اتنے دن دیارِ غیر امریکہ میں رہ کر آئے ہیں۔ اس لئے یہ ہمارے قریب نہیں آتے مگر بہت جلد پتہ چل گیا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ وہ ہمیں شیطان، مردود اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے اور برملا کہتے تھے کہ ہم ڈی ماپورز والے انسانوں کے بھیس میں

بلائیں ہیں۔ اور ایک نہ ایک دن اس گاؤں پر کوئی ایسی آفت لے کر آئیں گے کہ ایک فرد بھی زندگی نہ بچے گا۔

ایکس ہام کی مرمت اور تعمیر کے کام کے لئے انچسٹر کا کوئی آدمی تیار نہ ہوا۔ ان کے دلوں میں ہمارے خاندان کے خلاف صدیوں سے نفرت اور حقارت کا مادہ بھرا ہوا تھا۔ جو آہستہ آہستہ باہر نکل رہا تھا۔ انہوں نے ہمیں انچسٹر سے نکالنے کی بڑی کوشش کی، مگر پولیس ہماری مدد کے لئے موجود تھی اور پھر الفرڈ کی خدمات کا جب ذکر کیا جاتا جو اس نے اس جنگ میں انگلستان کے لئے ادا کی تھیں، تو لوگوں کا غصہ کچھ ٹھنڈا پڑتا، انہوں نے اس قصبے کے اندر رہنے کی اجازت تو دے دی۔ مگر ہمارے ساتھ کسی قسم کا تعلق رکھنا پسند نہ کیا۔ ہم نے اسی کو غنیمت سمجھا۔ انچسٹر کے لوگوں کے اس نامعقول اور بے ہودہ رویے سے ہمیں بے حد رنج ہوا۔ خصوصاً الفرڈ نے اسے بہت زیادہ محسوس کیا، اس کا کہنا تھا کہ انگریز جتنا قدامت پسند، محبِ وطن ہے، اُس سے کہیں زیادہ کینہ پرور اور تنگ دل بھی ہے۔ کیپٹن نوریز کبھی کبھی ہم سے ملنے آتا اور وہ بھی رات کی تاریکی میں...... کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ انچسٹر کا کوئی شخص اسے ہمارے پاس آتا جاتا دیکھے۔ وہ کسی قدر پست قامت اور فربہ آدمی تھا۔ طبیعت کا نرم اور بے حد خوش مزاج، اسے الفرڈ سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ کہا کرتا۔

''الفرڈ، فکر نہ کرو، میں تمہارے ابا کا ہر معاملے میں ساتھ دوں گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا، ایکس ہام کی مرمت کے کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں گا۔

بڑی مشکل سے چند راج مزدور باہر سے گراں معاوضے پر لائے گئے اور کام کا آغاز ہوا۔ لیکن چند روز بعد ہی اچانک الفرڈ کی حالت بگڑی اور اس سے پیشتر کہ میں کسی ڈاکٹر کو بلاؤں، اس نے آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ مرتے وقت اس کے لبوں پر بھی ایکس ہام کا نام تھا۔ الفرڈ کے مرنے سے پہلے میری کمر ہی ٹوٹ گئی۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کرتا اور ایکس ہام سے مجھے کیا دلچسپی تھی؟ چنانچہ میں نے امریکہ چلے

جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر کیپٹن نوریز نے دلاسا دیا اور کہا۔

''میں آپ کو اپنا حقیقی چچا تصور کرتا ہوں۔ الفرڈ کی بڑی خواہش تھی کہ ایکس ہام اس کے خاندان کو دوبارہ مل جائے۔ اس کی یہ خواہش پوری ہو چکی ہے۔ اب مرمت کا کام باقی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ الفرڈ کی روح کو تسکین پہنچانے کے لئے آپ اس کی دوسری خواہش رد نہ کریں گے۔

میں نے سر تسلیم خم کر دیا اور مرمت کا کام زور و شور سے شروع ہوا۔ میری خستہ حالت اور کیفیت دیکھ کر انچسٹر کے بعض معمر اور شریف لوگوں کے دل میں خدا نے رحم کے جذبات پیدا کر دیئے اور جب انہوں نے یہ سنا کہ میں محض اپنے آنجہانی بیٹے کی آخری خواہش پوری کرنے کے احترام میں ایکس ہام کی مرمت کرا رہا ہوں تو ان کے ذہن کسی قدر صاف ہوئے۔ اب وہ میرے کام میں روڑے اٹکاتے نہ گالیاں دیتے، تاہم اکثر لوگ ایسے تھے جو اب بھی مجھے آدمی کے بھیس میں شیطان سمجھ کر دور دور رہتے اور قریب سے گزرنا بھی پڑتا تو سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بناتے ہوئے گزرتے۔

انہی دنوں ایک اطالوی ماہر آثار قدیمہ مسٹر بسانیو انچسٹر میں آیا۔ اس کا مقصد ایکس ہام کو دیکھنا اور اس کے بارے میں مزید تاریخی معلومات حاصل کرنا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ اس کے معائنے کے لئے گیا اور جونہی ہم وادی سے گزر کر آخری سرے پر پہنچے اور ایکس ہام کے بلند بُرج دکھائی دیئے۔ بسانیو ٹھٹھک گیا۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کے آثار نمودار ہوئے اور آنکھیں تارہ سی بن گئیں۔ چند لمحے بعد اس نے اس انداز میں گردن ہلائی جیسے میری موجودگی سے بالکل بے خبر کسی نادیدہ شخص کے سوال کا جواب دے رہا ہو۔ میں پریشانی کے عالم میں اسے دیکھ رہا تھا۔ یکا یک وہ ہوش میں آیا اور مجھ سے معذرت طلب انداز میں بولا۔

''معاف کیجئے، میں ایک خیال میں گم ہو گیا تھا۔ عمارت لافانی اور بے حد

قیمتی ہے، بے حد قیمتی، میں اس عظیم خزانے کے مالک کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں جناب کہ یہ عمارت جس کی قدامت کا کوئی اندازہ فی الحال ممکن نہیں، آپ کے قبضے میں ہے"۔

میں چپ چاپ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ جب ہم اس اجڑے ہوئے، لیکن وسیع و عریض باغ میں داخل ہوئے، جو عمارت کے شرقاً غرباً پھیلا ہوا تھا، اور جہاں سے اس کا پرشکوہ اور عظیم دروازہ صاف دکھائی دیتا تھا، تو بسانیو کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔

"آؤ...... یہ دروازہ...... یہ بُرجیاں...... یہ کھڑکیاں...... یہ دیواریں......

انتہائی بے تابی اور اضطراب کے عالم میں وہ میری پروا کیے بغیر دوڑا اور دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ شاہ بلوط کے بنے ہوئے بلند دروازے کے نقش و نگار دیکھنا چاہتا ہے، لیکن وہ تو کچھ اور ہی دیکھ رہا تھا۔ اور جب میری اس پر نگاہ پڑی تو ایک لمحے کے لئے جیسے میرا خون سرد ہو گیا، یہ کسی نامعلوم دھات کا بنا ہوا سیاہ رنگ کا ایک بڑا مجسمہ تھا اور کس کا؟ چوہے کا...... بہت بڑے چوہے کا جس کا منہ بڑے بھیانک انداز میں کھلا ہوا تھا اور سفید نوکیلے دانت جو خدا جانے کس چیز سے بنائے گئے

تھے، صاف نظر آتے تھے، چوہے کی آنکھوں میں سُرخ رنگ کے چمکدار پتھر جڑے تھے۔ میرے ساتھی نے اپنا رومال نکالا اور گرد و غبار سے اٹے ہوئے چوہے کے اس مکروہ مجسمے کو صاف کرنے لگا۔ اب میں نے دیکھا کہ اس پر رومن الفاظ میں چند حروف لکھے ہیں جنہیں میرا ساتھی محدب شیشے کی مدد سے پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے لب سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ان الفاظ میں کھویا ہوا تھا میں نے اس سے پوچھنے کی کوشش کی، مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"جناب ذرا صبر کیجئے...... میں سب کچھ آپ کو بتاؤں گا......"

پھر وہ محل کے اندر گیا اور ایک ایک کمرے اور ایک ایک راہداری اور

برآمدے کو دیکھا جس چیز پر اس کی نظر پڑتی، وہیں جم جاتی کبھی کبھی وہ اپنی بغل میں دبی ہوئی ایک کتاب نکال کر کچھ دیکھتا اور پنسل سے کہیں کہیں نوٹ لکھتا۔ ایکس ہام کے مغربی حصے کی دیواریں اس کی خاصی دلچسپی کا باعث بن رہی تھیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان پرانی، بوسیدہ اور پلستر اکھڑی ہوئی سیاہ دیواروں میں اس شخص کو کیا نظر آیا تھا کہ وہ وہاں سے ٹلنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ پاگلوں کی طرح وہ ایک طرف سے دوسری طرف جاتا اور پھر فیتہ نکال کر دیواروں کی لمبائی چوڑائی ناپنے لگتا۔ اس دوران میں اس کی توجہ نہ ان ہزاروں چمگادڑوں کی طرف گئی جو ریک اور اونچی چھتوں کے اندر لٹکی ہوئی تھیں اور نہ مکڑیوں کے ان مہیب اور بڑے بڑے جالوں کو دیکھ سکا جو بار بار اس کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔ جنگلی کبوتروں اور چڑیوں کے وہ بے شمار گھونسلے جو ایکس ہام کے اندرونی اور تاریک گھروں میں جابجا بنے ہوئے تھے۔ اس کی نگاہ میں نہ

رات کو کھانے کے بعد جب وہ آرام سے بیٹھا قہوہ پی رہا تھا کہ میرے استفسار پر مدھم لہجے میں بولا۔

''سر میں حیران ہوں کہ کن الفاظ میں اس عظیم اور تاریخی عمارت کا ذکر کروں۔ یقین فرمایئے پورے انگلینڈ میں ایسی عمارت کوئی اور نہیں، میری معلومات کے مطابق اس کی تعمیر ۱۰۰۰ء سے قبل کی ہے۔ تاہم جو علامات میں نے دیکھی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایکس ہام پیلس کی جگہ پہلے ایک معبد تھا۔ جسے رومنوں کے ایک خاص فرقے نے تعمیر کیا تھا اور وہ چوہے کی پوجا کرتے تھے''

''چوہے کی پوجا؟'' میں چلا اٹھا۔ ''میں نہیں مان سکتا''

''آہ...... آپ نہ مانیں، لیکن یہ حقیقت ہے۔ بسانیو نے اسی لہجے میں کہا۔ ''آپ نے چوہے کا وہ مجسمہ نہیں دیکھا۔ جو صدر دروازے کے قریب رکھا تھا۔ اس زمانے میں رومنوں کے مختلف فرقے تھے جو شیطانوں اور بد روحوں کی عبادت کرتے اور ان کے لئے انسانی بھینٹ چڑھایا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ خدا کی نسبت

شیطان، انسان کے زیادہ قریب ہے اور وہ ان کی جلدی مدد کر سکتا ہے، اس لئے انہوں نے چوہے، سانپ، چمگادڑ، بھیڑیے کو اپنا دیوتا بنایا، وہ ان جانوروں کو شیطانی سمبل (Symbol) قرار دیتے تھے۔ اور ان کا کہنا ہے کہ ان جانوروں کے اندر شیطانی صفات اور خوبیاں دوسرے جانوروں کی نسبت کہیں زیادہ ہیں...... پرانی تاریخی کتابوں کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ زمانہ آگسٹائن سوم کا تھا جب کہ پلید اور مکروہ جانوروں کو پوجنے والے کئی خفیہ رومن فرقے وجود میں آ چکے تھے۔ اگرچہ حکومت کی طرف سے اس قسم کی پوجا اور قربانی سخت ممنوع اور نا قابلِ معافی جرم سمجھی جاتی تھی۔ تاہم اس دور میں سینکڑوں انسانوں کا خون بہایا گیا، میں جس رومن فرقے کا ذکر کرتا ہوں، اس کا دیوتا چوہا تھا۔ یہاں...... اس محل کے کئی بڑے کمروں میں ہزاروں لاکھوں چوہے پلے ہوئے تھے جنہیں انسانی خون اور گوشت کا چسکا ڈالا گیا۔ یہ آدم خور چوہے بڑے موٹے تازے اور خونخوار تھے۔ ایک روز یہ چوہے آزاد ہو گئے اور انہوں نے نہ صرف ایکس ہام کے اندر رہنے والے تمام جانوروں اور انسانوں کو چٹ کیا، بلکہ قصبہ انچسٹر میں بلا بن کر نازل ہوئے اور بڑی تباہی مچائی۔ کئی ماہ کی مسلسل کوششوں کے بعد انہیں چن چن کر مارا گیا اور چوہوں کی دشمنی اب تک انچسٹر کے لوگوں کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ اب یہاں کوئی چوہا نہیں ہے اور اگر کہیں باہر سے آ جائے تو یہ لوگ اس وقت تک دانہ پانی اپنے اوپر حرام سمجھتے ہیں جب تک چوہے کو ہلاک نہ کر لیں۔

''ایکس ہام کا پہلا بیرن ۱۲۶۱ء میں گزرا ہے۔ اس وقت انگلینڈ پر ہنری سوم حکمران تھا اور یہ وہی بیرن تھا جس نے اپنے خاندان کے تمام افراد اور نوکروں کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کا نام تھا گلبرٹ ڈی لاپور، جو بعد ازاں آپ کا خاندانی نام بن گیا۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ بیرنگ گلبرٹ کے اندر کسی چوہے کی روح حلول ہو گئی تھی جس کے زیر اثر وہ رات کو چوہا بن جاتا اور انسانی لہو پیتا اور گوشت کھاتا تھا اس کے بعد

جب نوریز فیملی نے ایکس ہام خریدا تو ان کی کئی عورتیں بھی چڑیلیں بن گئیں۔ یہ ۱۳۰۷ء کا واقعہ ہے ان میں لیڈی مارگریٹ ٹریور کا نام قابل ذکر ہے۔ جسے بعد ازاں انچسٹر کے لوگوں نے پکڑ کر آگ میں زندہ جلا دیا۔

جوں جوں وہ اپنی داستان سناتا گیا، میرے جسم کے رونگٹے دہشت سے کھڑے ہوتے گئے۔ حلق خشک ہو گیا اور ایسی اینٹھن سی اٹھنے لگی جیسے کوئی میرا گلہ دبا رہا ہو۔

''کیا بات ہے جناب آپ کی طبعیت ٹھیک ہے؟ بسانیو نے پوچھا۔

ابھی تک تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ اسی طرح یہ بھیانک اور بے سرو پا قصے سناتے رہے تو یقیناً خراب ہو جائے گی۔ غرض میں نے مصنوعی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے کہا اور وہ ہنس کر چپ ہو گیا۔

چند لمحے سنجیدہ رہنے کے بعد اس نے کہا۔

''لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس عمارت میں رہائش کا ارادہ ترک کر دیں؟

کیوں؟

''اس لئے کہ وہاں ابھی تک بدروح کا اثر ہے''

''آپ سائینسداں ہو کر ایسی باتیں مانتے ہیں۔

''سائنس کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ کیپٹن نوریز وہاں آ گیا اور گرم گرم بحث شروع ہو گئی جس کا اختتام اس پر ہوا کہ یہ روایات ممکن ہے کسی دور میں سچ ہوں۔ لیکن اب تو گزشتہ دو سو برس سے کسی شخص کو ایکس ہام سے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اس لئے وہاں رہنے میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرے یہ کہ انچسٹر والوں کے دل سے ایکس ہام کا

خوف اور دہشت نکالنے کے لئے بھی اب ضروری ہو گیا ہے کہ اس کا مالک وہیں جا کر رہے۔

جیسا کہ میں نے ابتداء میں کہا ۱۶ جولائی ۱۹۲۳ء کا وہ منحوس دن تھا جب میں نے رہائش کے ارادے سے ایکس ہام میں قدم رکھا۔ مرمت ہونے کے بعد عمارت کی شکل ہی کچھ اور نکل آئی تھی اور اس سے پیشتر جس ویرانی اور سناٹے کا احساس ہوتا تھا، وہ احساس اب کسی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ میرے عملے میں سات ملازم اور نو بلیاں شامل تھیں۔ شاید آپ یہ سمجھیں کہ میں نے ایکس ہام کے آدم خور چوہوں کے ڈر سے یہ بلیاں پالی ہوں گی۔ جی نہیں بلکہ یہ بلیاں پالنے کا شوق مجھے بچپن سے ہے اور جس وقت میں امریکہ سے چل کر انگلستان پہنچا ہوں، اس وقت بھی میرے پاس بارہ بلیاں تھیں جن میں تین خدا کو پیاری ہو گئیں اور نو باقی بچیں۔ ان میں سے سیاہ رنگ کی ایک بڑی خوبصورت سیامی بلی مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی اور وہ بھی ہر وقت میرے دم کے ساتھ لگی رہتی تھی۔ حتیٰ کہ رات کو میرے بستر پر پائنتی کی طرف سوتی اور اپنے اگلے پنجے اس خیال سے میرے پیروں پر رکھتی کہ میں اس کی بے خبری میں کہیں چلا نہ جاؤں اس کا نام میں نے ''کوئین'' رکھا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور عادتیں بالکل شاہانہ تھیں اور وہ گزشتہ سات برس سے میرے پاس تھی۔

ایکس ہام میں آنے کے بعد پانچ دن انتہائی سکون اور آرام سے گزرے۔ اس مکان کے چپے چپے اور گوشے گوشے پر میرے عظیم آباؤ اجداد کے نقوش مرتسم تھے اور در و دیوار انہی کی داستان زبانِ حال سے سناتے تھے۔ کیپٹن نوریز اب مجھے اپنے بیٹوں کی طرح عزیز تھا۔ کیوں کہ وہ میرے آنجہانی بیٹے الفرڈ کا پیارا اور قابل اعتماد دوست تھا۔ وہ دن کا بیشتر حصہ میرے پاس ہی رہتا اور طرح طرح کے قصے کہانیاں اور لطیفے سنا کر الفرڈ کا غم میرے دل سے نکالنے کی کوشش کرتا۔

۲۲ جولائی کے روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھے کچھ سوچنے اور غور

کرنے پر مجبور کر دیا تاہم میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ٹالنا چاہا اور کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ قصہ یہ تھا کہ اس دن میری چہیتی بلی کوئین خلافِ معمول بے حد مضطرب اور بے چین نظر آئی۔ اس نے اپنا ناشتہ بھی نہ کیا اور سارا دن ایکس ہام کے مغربی حصے میں گھومتی رہی۔ یہ حصہ میں نے اپنی رہائش کے لئے بہتر اور مناسب خیال کیا تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ دور تک جاتی اور پھر اپنے پنجوں سے اسے کھرچنے کی کوشش کرتی۔ کبھی کبھی وہ رک کر دیوار کو گھورنے لگتی اور اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا اسے کیا ہو گیا ہے۔ تیسرے پہر جب میں دوسری منزل پر اپنی مختصر سی لائبریری میں بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک ملازم اندر آیا۔ اس کی چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کے ہلکے ہلکے تاثرات میں نے صاف پڑھ لئے۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں اس نے کہا۔

''سرکار۔ تمام بلیاں بے چین ہیں...... وہ نہیں بیٹھتیں، پوری عمارت میں ادھر سے ادھر بھاگی دوڑی پھرتی ہیں۔ عین اسی لمحے کوئین جو میرے قدموں میں چپ چاپ گردن جھکائے آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی، چونک کر سامنے مغربی دیوار کی طرف گھورنے لگی۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے، پھر وہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس انداز میں آگے بڑھی جیسے اپنے شکار پر جھپٹنے کا ارادہ کر رہی ہو لیکن وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ دیوار کی قریب پہنچ کر وہ اسے سونگھنے اور پھر پنجے سے کھرچنے لگی۔ میں نے اسے ڈانٹ کر اپنے پاس بلایا۔ وہ آ تو گئی، لیکن اس کی تجسس اور مضطرب نظریں دیوار ہی پر جمی رہیں۔ میرا ملازم بھی اس کی یہ حرکت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔

''جناب ساری بلیاں بالکل اسی طرح کر رہی ہیں...... خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا معاملہ ہے''۔

''شاید انہیں ان دیواروں سے چوہوں کی بو آتی ہے'' میں نے کہا۔ صدیوں پیشتر یہاں ہزارہا چوہے رہتے تھے۔ یقیناً ان کی بُو ابھی تک باقی ہو گی اور چونکہ بلیوں

کی قوتِ شامہ ہماری نسبت تیز ہے، اس لئے وہ اس بُو کو پا کر بے چین ہو رہی ہیں۔ جاؤ گھبرانے کی کیا بات ہے، دو چار دن میں بلیاں اس کی عادی ہو جائیں گی۔

''لیکن سرکار، شروع کے پانچ دن بھی تو یہ بلیاں یہیں رہی ہیں، اس وقت انہوں نے کوئی بُو کیوں نہ پائی؟ ملازم نے پوچھا اور میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ میرے پاس اس دلیل کا کوئی جواب نہ تھا، چنانچہ میں نے ذرا ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے ٹال دیا۔ جب وہ سلام کر کے جا چکا تو میں کرسی سے اٹھا اور مغربی دیوار کا معائنہ کرنے کے ارادے سے آگے بڑھا، لیکن دوسرے ہی لمحے کوئین مجھ سے پہلے دیوار کے پاس پہنچ چکی تھی اور اب اس کے کھلے منہ سے غرغر کی ہلکی آواز بھی برآمد ہونے لگی۔ میں نے دیوار پر ہاتھ پھیرا تو یوں محسوس ہوا جیسے یہ دیوار چونے اور پتھر کی نہیں، کسی نرم کھال سے بنی ہوئی ہے۔ خدا کی پناہ...... میرے بدن میں ایک ثانیے کے لئے تھرتھری سی چھوٹ گئی، مگر فوراً ہی یہ احساس جاتا رہا، اب میں ایک بوسیدہ لیکن سخت دیوار پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اور بلی عالم دیوانگی میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک بار بار آ جا رہی تھی۔

سورج غروب ہونے کے فوراً بعد تمام بلیاں پرسکون ہو گئیں اور اپنے اپنے کمروں میں جہاں انہیں رکھا گیا تھا، آرام سے جا بیٹھیں، میں نے حسب عادت تنہا کھانا کھایا اور چونکہ بہت جلد سو جانے کا عادی ہوں، اس لئے کوئین کو لے کر اپنی خواب گاہ میں چلا گیا، یہ خواب گاہ ایکس ہام کے جنوبی حصے میں سب سے الگ تھلگ واقع تھی۔ انچسٹر کی طرف سے اٹھنے والے شور کی آواز بمشکل ہی یہاں پہنچتی، اس لئے میں نے اس کمرے کا انتخاب کیا تھا۔

کمرے میں داخل ہو کر میں نے لکڑی کا بھاری، مگر بے حد مضبوط دروازہ اندر سے بند کر لیا، اور کھڑکیوں کے پردے گرا دیے اور خود آرام دہ نرم بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، حتیٰ کہ کسی جانور کے بولنے کی

آواز بھی کان میں نہ آتی۔ ایکس ہام کے نواح میں پھیلا ہوا ویران اور اجڑا ہوا باغ پرندوں سے خالی پڑا تھا۔ البتہ آسمان پر بڑی بڑی چمگادڑیں ضرور اڑ رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ خاصی نیچے آ جاتیں، لیکن ان کے پھیلے ہوئے مکروہ پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔

میری نظروں کے عین سامنے شمال کے رخ ایک کھڑکی تھی جس کا پردہ میں نے دانستہ نہیں کھینچا تھا تاکہ باہر سے تازہ ہوا آتی رہے، اگرچہ سورج غروب ہوئے دیر ہو چکی تھی اور چاند غالباً رات کے پچھلے پہر صرف تھوڑی دیر کے لئے نکلنے والا تھا، تاہم مغرب کی طرف آسمان پر چند رنگ برنگی قوسیں اور زاویے چمکتے دکھائی دیے۔ ان کی شکلیں بار بار بدل رہی تھیں۔ میں دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا پھر نہ جانے کب نیند کی آغوش میں جا پہنچا لیکن فوراً ہی ایک بھیانک خواب دیکھا اور پھر آنکھ کھل گئی۔ میرے سرہانے جلتے ہوئے تیل کے لیمپ کی روشنی مزید مدھم پڑ چکی تھی، باہر گھپ اندھیرا تھا،

میں نے اپنے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز خود سنی اور بدن کو پسینے میں تر بتر پایا۔ خدا کی پناہ، کیسا عجیب اور ڈراؤنا خواب تھا، میں نے ہاتھ بڑھا کر قریبی میز پر سے پانی کا گلاس اٹھانا چاہا اور اس اثنا میں پائنتی کی جانب نگاہ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں، میری وفادار سیاہ بلی اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھی سامنے دیوار پر ٹکٹکی باندھے تک رہی ہے۔ اس کے کان کھڑے تھے اور آنکھیں ..... اُف، دہکتے ہوئے سُرخ کوئلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ بلی کی یہ کیفیت اس سے پہلے کبھی میں نے مشاہدہ نہ کی تھی۔ مجھے اس سے ڈر لگنے لگا۔ اگرچہ وہ مجھے بستر میں حرکت کرتے دیکھ چکی تھی، مگر اس نے ذرا جنبش نہ کی اور یونہی بیٹھی دیوار کو گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں کی چمک دم بدم بڑھتی جاتی تھی۔ میں نے پیار سے اسے آواز دی، لیکن اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی اور چھلانگ لگا کر بستر سے نیچے کود گئی۔ اب وہ انتہائی احتیاط اور چالاکی سے ایک ایک انچ کر کے دیوار کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے بھی دیوار کی طرف دیکھا، مگر وہاں کچھ نہ تھا، تاہم

بلی کی حرکات اور اس کے پُر اسرار تیور ظاہر کرتے تھے کہ وہ ضرور کسی شے کے تعاقب میں ہے۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر بلی نے منہ آگے کیا اور دیوار کو خوب سونگھا، پھر وہ باری باری اپنے دونوں پنجے دیوار پر رگڑنے لگی۔ دیوار پر اس کے لمبے، تیز نکیلے ناخن چلنے کی آواز اس وقت مجھے یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی بڑھئی لکڑی پر آرا چلا رہا ہے۔

یک لخت میرا دل اس زور سے دھڑکا جیسے اچھل کر سینے سے باہر آ جائے گا۔ ہاتھ پیر سنسنانے لگے اور مجھ پر غشی سی طاری ہوئی۔ میں نے اس وقت کچھ دیکھا نہیں۔ البتہ ایک اور آواز سنی جس نے مجھے اس حالت کو پہنچا دیا۔ خدا رحم کرے...... واقعی انہی کی آواز ہے یا...... یا میرے کان بج رہے ہیں۔ میں نے جلدی سے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ میں ختم کر کے میز پر رکھ دیا۔ اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے دوبارہ اس آواز کی طرف کان لگائے۔ اب میں واضح طور پر سُن سکتا تھا کہ کمرے کے اندر ایک عجیب مدھم سا شور برپا ہے اور اس کی آواز اس سامنے والی دیوار کے اندر سے اٹھ رہی ہے جسے بلی دیوانہ وار کھرچنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ یہ چوہوں کے بولنے اور پنجے مارنے کی آواز تھی۔ ایسی آواز جس سے اتنا اندازہ ہوتا تھا کہ دیوار کے پرلی طرف ایک دو نہیں، ہزارہا چوہے موجود ہیں۔ آدم خور اور خوں خوار چوہے، میں نے لیمپ کی بتی اونچی کر دی، بستر سے اٹھا، اور دیوار کے قریب گیا، مگر اتنی دیر میں آواز غائب ہو چکی تھی۔ بلی نے حیرت اور غصے کی ملی جلی نظروں سے مجھے دیکھا، پھر مایوسی سے چلتی ہوئی بستر پر چڑھ کر پائنتی کی طرف لیٹ گئی۔

میں دیر تک جاگتا اور اس معاملے پر غور کرتا رہا۔ کئی بار اس دیوار کا معائنہ کیا، اسے خوب بجا بجا کر دیکھا کہ شاید کہیں خفیہ راستہ ہو یا اندر سے کھوکھلی ہو، مگر بے سود، بلی اب ان باتوں سے بے پروا آرام کی نیند سو رہی تھی اور مشرق کی جانب آسمان کا رنگ کچھ کچھ سفید اور کچھ کچھ گلابی ہو چلا تھا۔

اگلے روز میں نے تمام نوکروں کو طلب کر کے دریافت کیا کہ کوئی غیر معمولی بات انہوں نے محسوس کی؟ لیکن سب کا جواب یہی تھا کہ بلیوں کی خلافِ معمول بے چینی کے سوا انہوں نے کوئی ایسی بات نہ پائی جو قابل ذکر ہو، باورچی نے صرف اتنا بتایا کہ اس کے ساتھ رہنے والی بلی جو قریب ہی فرش پر پڑی سوتی تھی، آدھی رات کو یکا یک بیدار ہو کر نہایت ڈراؤنی آواز میں غرانے اور دیواروں پر پنجے مارنے لگی۔

''جناب، اس بلی کی حالت دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ شاید کوئی دوسرا جانور کمرے میں آ گیا ہے یا زیادہ کھانے کے باعث بلی کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔ مگر ان دونوں میں سے کوئی بات بھی نہ تھی۔ میں نے خود کمرے میں گھوم پھر کر دیکھا، وہاں کچھ نہ تھا''۔

دوپہر کو کیپٹن نوریز جب میرے پاس آیا اور میں نے یہ تمام واقعہ بیان کیا۔ اس کا خوب صورت روشن چہرہ یک لخت مارے دہشت کے سفید پڑ گیا اور نیلی آنکھیں رنگت بدلنے لگیں پیشانی پر نمودار پسینے کے قطرے سونتتے ہوئے اس نے کہا۔

''انکل، ممکن ہے یہ آپ کا وہم ہو...... مگر...... آپ کہتے ہیں کہ چوہوں کی آوازیں آپ نے خود اپنے کانوں سے سنی ہیں''

''ہاں ہاں، میں ساری رات سو نہ سکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں کسی جگہ...... تہہ خانے یا بند کوٹھڑی میں، ان مغربی دیواروں کے پیچھے یا نیچے ہزاروں چوہے موجود ہیں۔ میری ساری بلیاں ساری رات مضطرب اور پریشان رہی ہیں۔ اس کی شہادت گھر کے نوکر بھی دے سکتے ہیں۔

''کیا نوکروں نے بھی اپنے کانوں سے چوہوں کی آوازیں سنی ہیں؟''

''میں اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، ممکن ہے سُنی ہوں یا نہ سُنی ہوں، لیکن بلیوں کی حرکات کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا''۔

کیپٹن نوریز کے چہرے پر ایک رنگ آتا، ایک جاتا...... کچھ کہے بغیر وہ بے

تابی سے کمرے کے اندر ٹہلنے لگا، اس نے ہر دیوار کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔فرش پر زور زور سے پیر مارے، پھر کہنے لگا......''میری عقل حیران ہے کہ کیا کہوں اور کیا سمجھوں۔

آپ کا مشاہدہ اس قدر واضح اور مکمل ہے کہ اسے جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا، لیکن دوسری طرف اتنا مجھے معلوم ہے کہ ایکس بام کے اندر ان سنگین اور کئی کئی فٹ موٹی دیواروں کے پیچھے کوئی چوہا نہیں ہے اور اگر ہو بھی تو اس کی آواز آپ تک پہنچ کس رستے سے۔

''یہ میں نہیں جانتا...... میں نے اس کی بحث سے اکتا کر ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

''بہر حال میں صحیح کہہ رہا ہوں، آج رات بھی ممکن ہے کچھ ایسا ہی معاملہ ہو۔تم صبح ضرور میرے پاس آنا۔پھر بتاؤں گا''

جیسا کہ مجھے توقع تھی، اس رات بھی یہی واقعہ پیش آیا۔بستر پر لیٹتے ہی میں نے ایک بھیانک خواب دیکھا۔کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ڈراؤنی صورت کا شخص جس کے دانت باہر نکلے ہوئے اور ناخن بے حد لمبے لمبے ہیں، میرے کمرے میں موجود ہے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔وہ میری طرف اس انداز سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو،

''تو میرے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا، دیکھ غور سے دیکھ......''

پھر میں نے دیکھا کہ اس نے پشت پر اشارہ کیا اور لاکھوں کروڑوں چوہوں کی ننھی ننھی سرخ آنکھیں چمکتی دکھائی دیں۔وہ چیں چیں کرتے ہوئے دفعتہً میری مسہری کی طرف بڑھے اور...... گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے آپ کو پسینے میں شرابور پایا اور دل کی دھڑکن عروج پر تھی۔کانپتے ہاتھوں سے میں نے اپنے سرہانے رکھا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا اور لبوں تک لایا تھا کہ پائنتی سونے والی بلی کے پنجے میرے پاؤں میں گڑ گئے۔درد کی شدت سے میں بلبلا گیا اور وہ اسی طرح سامنے والی دیوار کو گھور رہی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے لیمپ کی بتی اونچی کی،

کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ لیکن آہ...... خون سرد کر دینے والی وہ منحوس آواز...... چوہوں کی آواز اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی...... یہ خواب میں دکھائی دینے والی چوہوں کی آواز نہ تھی، بلکہ اس کمرے کے اندر چوہوں کی دیواریں زندہ ہو گئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر دیوار ان کے بوجھ سے لرز رہی ہے۔ کانپ رہی ہے اور پھر...... بلی نے جست کی اور دیوانہ وار شمالی دیوار کو سونگھتی، کبھی پنجے مارتی، میاؤں میاؤں کی آواز سے کمرہ گونجنے لگا۔ بلی کے جنون میں ہر لحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ بند دروازے کی طرف گئی اور اسے پنجوں سے کھرچنے لگی۔ لکڑی پر تیز پنجوں کے رگڑنے کی آواز اس اعصاب شکن ماحول میں کیسی عجیب لگ رہی تھی۔

میں نے بستر سے اٹھ کر لیمپ ہاتھ میں لیا اور لکڑی کا بنا ہوا بھاری دروازہ کھول دیا بلی جھپٹی اور تاریکی میں سنگین زینے کی سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ باہر خاصی تیز ہوا چل رہی تھی اور ایکسہام کے عقبی حصے میں واقع مرگھٹ میں سے ایک ڈراؤنا شور اٹھ رہا تھا۔ جیسے ہزاروں بدروحیں چلا رہی ہوں۔ لیکن یہ شور ان بے جان شاخوں اور مردہ ٹہنیوں کا تھا جو ہوا کے زور سے ہل کر آپس ہی میں ٹکراتی تھیں۔ چند لمحے راہداری کے کنارے کھڑے رہنے اور بلی کے واپس آجانے کا بے سود انتظار کرنے کے بعد میں بھی نچلی منزل کی طرف چلا۔ لیمپ میرے دائیں ہاتھ میں تھا اور بائیں ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتا ہوا ایک ایک سیڑھی نیچے اترنے لگا۔

بلی خدا جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ نچلی منزل میں عین اس کمرے کے نیچے جسے میں نے خواب گاہ بنا رکھا تھا۔ ایک وسیع و عریض تہہ خانہ تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا تھا اور اس کے اندر سے چوہوں کے چیں چیں کرنے اور دیواروں کو کھرچنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ دھڑکتے دل اور ماؤف ذہن کے ساتھ میں نے تہہ خانے میں جھانکا۔ لیکن وہاں کچھ نہ تھا۔ البتہ میری پالتو بلی اسی جنون و

اضطراب کے عالم میں سنگین دیواروں سے سر پھوڑ رہی تھی۔ معاً چوہوں کی آواز تھم گئی۔ آواز تھمتے ہی بلی نے گردن اٹھا کر تھکی تھکی نظروں سے میری جانب دیکھا اور پھر میرے پاس آ کر پیر چاٹنے لگی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں ننگے پاؤں ہی نیچے چلا آیا ہوں۔

صبح اپنے وعدے کے مطابق کیپٹن نوریز میرے پاس آیا اور میں نے الف سے لے کر یے تک گزشتہ رات کا سارا قصہ سنایا۔ اس مرتبہ اسکے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نمودار نہ ہوئی۔ اس نے سب نوکروں کو ایک جگہ جمع کیا اور پوچھا کہ ان میں سے کسی نے گزشتہ رات چوہوں کی آواز سنی ہے؟ سبھی نوکر اس سوال پر دم بخود تھے اور ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر ایک بڑھے خانساماں نے زبان کھولی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''کیپٹن، ہم میں سے کسی نے کوئی آواز نہیں سُنی اور نہ کسی کو دیکھا...... ہاں، ہماری بلیاں ضرور رات کو بے چین ہوتی ہیں، ممکن ہے انہیں کچھ سنائی دیتا یا نظر آتا ہو۔

''تم میں سے کسی شخص نے رات کو کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا''

''نہیں جناب، ہم میں سے کسی نے کوئی خواب نہیں دیکھا: سب کی طرف سے متفقہ جواب ملا۔

''اچھا تم لوگ جاسکتے ہو''۔ کیپٹن نے ان کو رخصت کیا اور مجھ سے کہنے لگا۔

''انکل بڑا پُر اسرار معاملہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ چوہوں کی آوازیں صرف آپ ہی کو سنائی دیتی ہیں اور دوسروں کے کان اس سے محروم ہیں۔

''گویا میں ہی پاگل ہوں...... خبطی ہوں...... دیوانہ ہوں، میرے کان بجتے ہیں۔ اُف خدایا، کس طرح سمجھاؤں...... ممکن ہے یہ منحوس چوہے عمارت کے اسی حصے میں ہوں جہاں میں رہ رہا ہوں اور دوسرے حصوں میں نہ ہوں۔

''ہاں، یہ ممکن ہے'' کیپٹن نوریز نے اقرار کیا۔ آیئے ذرا ایک نظر اس تہہ خانے کا معائنہ کرتے ہیں جو نچلی منزل میں ہے۔

دن کی روشنی میں بھی تہہ خانہ تاریک اور سرد تھا اور اس کے اندر جاتے ہوئے خوف آتا تھا۔ زنگ آلود لوہے کی سلاخوں کا بنا ہوا دروازہ جو نہ جانے رات میں کس طرح؟ بند ہو گیا تھا، میں نے اور کیپٹن نے بڑا زور لگا کر کھولا اور پتھر کی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے نیچے اتر گئے۔ کیپٹن نے جیب سے برقی ٹارچ نکالی اور اس کا بٹن دبا دیا۔ تہہ خانہ کیا تھا، ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا۔ جس کے ایک گوشے میں صدیوں پرانا فرنیچر اور کپڑے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں عجیب سی ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ جونہی ہم اندر داخل ہوئے چند بڑی چمگادڑیں پھڑ پھڑاتی ہوئی کسی گوشے سے نکلیں اور دروازے سے باہر نکل گئیں۔ پختہ فرش پر گرد و غبار کی دبیز تہہ جمی ہوئی تھی۔ تہہ خانے کے شمالی حصے میں ایک اونچا چبوترہ دکھائی دیا جس پر ایک بڑا پتھر کتبے کی صورت میں لگا ہوا تھا۔ کیپٹن نے رومال سے اسے صاف کیا تو چند عجیب سی شکلیں، حروف اور نہ جانے کیا کیا لکھا ہوا نظر آیا۔

''آہ...... یہ قربان گاہ ہے'' کیپٹن نوریز نے دبی آواز سے کہا۔

''دیکھیے، خون کے بڑے بڑے دھبے ابھی تک موجود ہیں جو قربان گاہ کے سنگین چبوترے پر جما ہوا تھا اور امتدادِ زمانہ کے باعث اس کی رنگت خاکستری ہو چکی ہے۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے، اس کے نیچے کوئی چھوٹا تہہ خانہ اور بھی ہے۔ نوریز بولا۔ آپ دیکھتے ہیں فرش پر چلنے سے کیسی آواز نکلتی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے نیچے بھی کچھ ہے۔

''میں نے سنا ہے رومن اپنے خفیہ تہہ خانے اس انداز میں بناتے تھے کہ کوئی غیر آدمی ان کے اندر جانے کا راستہ آسانی سے تلاش نہیں کر سکتا تھا۔

''بے شک یہ صحیح ہے'' نوریز نے کہا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تہہ خانے میں وہ اپنے دیوتا پر انسانی جانوں کی بھینٹ چڑھاتے اور بعد ازاں اس سے نچلے تہہ خانے میں لاشیں پھینک دیتے تھے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ نچلے تہہ خانے میں چوہے رہتے تھے۔ اور وہی یہ لاشیں چٹ کر جاتے ہوں گے''۔

نوریز کے یہ الفاظ سن کر مجھ پر کپکپی طاری ہوگئی۔ معاً میں نے اپنی پشت پر کوئین کی آواز سنی۔ وہ اپنا سر میرے پیروں پر رگڑ رہی تھی۔

''آہ! آپ کی بلی...... اس نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ نوریز بلی کی طرف دیکھ کر بولا۔

''نہ معلوم مجھے اس سے ڈر کیوں لگتا ہے۔ کہتے ہیں سیاہ رنگ کی بلیوں کے بھیس میں بدروحیں ہوتی ہیں۔ وہ آپ ہی آپ اس بات پر ہنسا اور قربان گاہ کا معائنہ کرنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ خفیہ تہہ خانے کا راستہ اسی میں سے ہو کر جاتا ہوگا۔ ذرا اپنے آدمیوں کو بلایئے اور کہیے کہ کدالیں اور ہتھوڑے لے کر آجائیں۔ میں یہاں سے فرش اکھیڑنا چاہتا ہوں، لیکن ٹھہریے، یہ کیا چیز ہے؟ اس نے ایک کونے میں پڑی ہوئی وزنی سی سلاخ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ان لوگوں کو بلانے کی ضرورت نہیں، خواہ مخواہ ڈریں گے اور طرح طرح کی باتیں قصبے میں پھیلائیں گے۔ ہمیں خود ہی سب کام کرنا ہوگا''

اور اس سے پیشتر کہ میں اسے روکوں یا کچھ کہوں، اس نے لوہے کی یہ سلاخ قربان گاہ کے عظیم پتھر میں لگے ہوئے لوہے کے کڑے میں پھنسائی اور پوری قوت صرف کر دی۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چند لمحے بعد ہی مہیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ وزنی پتھر اپنی جگہ سے سرک گیا اور وہاں ایک تنگ سا راستہ نمودار ہوا میں اسے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔

''ٹھہرئیے انکل، ٹھہریئے جلدی نہ کیجئے، نوریز نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''نہ جانے کتنی صدیوں بعد یہ تہہ خانہ کھلا ہے۔ ذرا گندی ہوا نکل جانے دیجئے پھر اندر اتریں گے، اس نے اپنی ٹارچ کی روشنی اس تنگ سرنگ نما راستے میں پھینکی۔

ہمارے اترنے سے پہلے بلی آگے بڑھی اور اس سرنگ میں غائب ہوگئی

کیپٹن نوریز اس کے پیچھے گیا اور میں آخر میں اترا...... اُف ...... یہاں تو سرنگوں کا ایک جال سا بچھا ہوا تھا، ہم کوئی نو دس فٹ گہرائی میں چل رہے تھے۔ راستہ پتھروں کا بنا ہوا تھا اور دونوں جانب پختہ دیواریں تھیں۔ ابتداء میں تو بدبو کا احساس ہوا۔ لیکن چند لمحے بعد ایک طرف سے تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور ہمارے قریب سے گزر گیا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سُرنگیں بنانے والوں نے تازہ ہوا کا انتظام خوب کر رکھا تھا۔ نوریز نے کہا۔ ٹارچ کی روشنی میں راستہ طے کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے رہے۔ بلی نہ جانے کہاں میاؤں میاؤں کر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے ایک ایسی چیز دیکھی جس کے باعث ہماری قدم آگے بڑھنے سے رک گئے۔ یہ انسانی ہڈیوں اور کھوپڑیوں کا عظیم الشان ڈھیر تھا۔ جس میں بلی نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ اس طرح کے اور کئی ڈھیر ہمیں جا بجا دکھائی دیئے، ان ہڈیوں کا فاسفورس اندھیرے میں خوب چمک رہا تھا اور یہ منظر ایسا لرزہ خیز اور دل دوز تھا کہ بھلایا نہیں جاسکتا۔ ہڈیوں کے انہی ڈھیروں میں سے بعض کھوپڑیاں ہم نے ایسی دیکھیں جن کی ساخت بن مانسوں کی کھوپریوں سے ملتی جلتی تھی۔ چوہوں اور دوسرے جانوروں کی بوسیدہ ہڈیاں بھی کثیر مقدار میں جمع تھیں۔'' خدا کے لئے جلدی یہاں سے نکل چلو، انکل ......'' کیپٹن نوریز نے بدحواس ہوکر کہا۔

''میں یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے ابھی ان ہڈیوں کے اندر سے چوہوں کا ایک لشکر جرار نکل کر ہم پر ٹوٹ پڑے...... آہ......''

اس کے حلق سے چیخ نکلی اور اندھا دھند آگے بھاگنے لگا۔ میری پالتو بلی پوری قوت سے اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی۔ چونکہ ٹارچ نوریز کے ہاتھ میں تھی

اس لئے اس کے چلے جانے سے سرنگ میں گھپ اندھیرا ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو تنِ تنہا کھڑے پایا۔ انسانی ہڈیوں کا ڈھیر صدیوں پُرانی سرنگیں ...... ادم خور چوہے ...... میرا سر چکرانے لگا اور پھر ...... جیسے خون میری رگوں میں جم گیا۔ ہڈیوں کے اس عظیم ڈھیر کے اردگرد، اوپر نیچے اور دائیں بائیں ...... چاروں طرف چوہے ہی چوہے تھے ...... موٹے تازے بلی کی سی قدوقامت والے خوفناک چوہے ...... وہ اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں اُن کے نوکیلے سفید دانت بخوبی دیکھ رہا تھا، اس اندھیرے میں ...... ان کے سانس لینے کی آواز برابر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ وہ نئے آدمی کے آنے سے بے حد خوش اور چلا چلا کر دوسرے چوہوں کو اپنے قریب آنے کی دعوت دے رہے تھے۔

نہیں ...... ہرگز نہیں ...... میں اپنے آپ کو ان چوہوں کا کھاجا کبھی نہ بننے دوں گا ...... کبھی نہیں ...... میرے حلق سے ہذیانی چیخیں نکلنے لگیں ...... میں بھی اندھا دھند سرنگ میں دوڑنے لگا ...... کیپٹن نوریز جائے جہنم میں ...... یہ سب کیا دھرا اسی کا ہے۔ اسی نے میرے بیٹے کو ایکس ہام خریدنے کا لالچ دیا تھا ...... اسی کے باعث میرے بیٹے کی ٹانگیں ضائع ہوئیں ...... آخر وہ مر گیا ...... میرا خوبصورت اور وفادار بیٹا ...... لیکن میں نہیں مر سکتا۔ کوشش کے باوجود مجھے اوپر جانے کی راہ نظر نہ آئی اور میں ایک ستون سے ٹکرا کر فرش پر گر گیا۔ میری نظروں کے سامنے چنگاریاں سی اڑنے لگیں۔ چوہے میرے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ اب میں ان کی مکروہ کھالیں اپنے بدن سے مس ہوتے ہوئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ مجھے چبا جائیں گے، کچھ بھی نہ چھوڑیں گے ...... مجھے بھاگنا چاہیے۔ میں نے اٹھنا چاہا، مگر اٹھنے کی ہمت نہ تھی ...... پھر میں تاریکی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبتا چلا گیا۔

تین گھنٹے بعد میری آدمیوں نے مجھے وہاں سے اٹھایا۔ اس وقت میں ہوش میں تھا، لیکن وہ کہتی تھے کہ میرے کپڑے اور ہاتھ پیر خون میں لت پت ہیں۔ پھر پولیس نے مجھے گھیرے میں لے لیا...... انہوں نے میرے سامنے کیپٹن نوریز کی لاش وہاں سے اٹھائی...... میں اسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا...... اسے یقیناً چوہوں نے مار ڈالا تھا اور آدھا دھڑ بھی ہڑپ کر گئے تھے، کیونکہ مجھے نوریز کی ٹانگیں نظر نہیں آئیں...... اور میری پالتو بلی...... کوئین کہاں تھی...... وہ قریب ہی تھی...... بالکل قریب...... ایک سپاہی نے اسے پکڑ رکھا تھا...... بلی کے پنجے اور منہ خون سے بھرا ہوا تھا...... پولیس انسپکٹر کی خشمگین نگاہیں میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو...... یہاں ہزاروں چوہے ہیں...... تمہیں ایک سیکنڈ میں ہڑپ کر جائیں گے...... دیکھتے نہیں، انہوں نے نوریز کو مار ڈالا ہے...... اس کا آدھا دھڑ کھا گئے ہیں......''

وہ مجھے سرنگ سے باہر لے آئے...... وہاں اور بھی بہت سے لوگ کھڑے تھے...... انچسٹر کے ظالم اور بے رحم لوگ مجھے دیکھ کر سب دور دور ہٹ گئے جیسے میں کوئی بھوت ہوں...... پولیس افسروں نے مجھے ایک لمبی گاڑی میں بٹھایا اور نہ جانے کہاں لے گئے۔ ایک بڑی سی عمارت میں۔ پھر انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں بند کر دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ میں پاگل ہوں...... میں نے کیپٹن نوریز کو قتل کر دیا ہے...... بے وقوف کہیں کے...... میں اسے قتل کیوں کرتا...... اسے تو چوہوں نے ہلاک کیا ہے......

☆☆☆

معاوضہ

(مقبول جہانگیر)

کرسٹوفر الگزینڈر رچلیٹ کی کل کائنات چار چیزیں تھیں جن کا وہ بلا شرکت غیرے مالک تھا۔ نام جو اس کے وجود سے چسپاں تھا۔ ایک سوٹ، جسے وہ پہن کر سوتا بھی تھا۔ رخساروں پر بھورے بھورے بال اور شراب کی کبھی نہ بجھنے والی تشنگی، ان کے علاوہ کائنات کی اس دائرے سے باہر ایک دوست بھی تھا۔ جزیرہ فوفوٹی میں دوستی کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی خصوصیت لازمی تھی۔ طاقت، چھکلے بازی یا غنڈہ گردی کے بغیر دوست کا ملنا آسان نہ تھا۔ کرسٹوفر ان تینوں صفات سے محروم تھا، اس لئے اس کی اور نیگرو کاراکی، کی دوستی کو لوگ تعجب سے دیکھتے تھے۔

کرسٹوفر مرنجان مرنج آدمی تھا، وہ کبھی کسی سے لڑتا جھگڑتا نہ تھا اس نے کبھی گھونسا نہیں تانا تھا دراصل اس کے علم ہی میں نہ تھا کہ خدا نے سفید فام نسل کو پاؤں اس لئے عطا کیا ہے کہ وہ کالوں کو ٹھوکریں لگائے۔ وہ خود کے سوا کسی کو ستاتا بھی نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ چینی شراب فروش مائے جیک کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ لیتا جو اسے نہایت گھٹیا برانڈی مہیا کرتا تھا۔

کرسٹوفر ذریعہ معاش کی پابندی سے آزاد تھا۔ دراصل اس کی ضروریاتِ زندگی محدود تھیں دن میں ایک آدھ بار کھانا اور شراب کی ایک بوتل، گھربار کا جنجال نہ تھا۔ جہاں ٹھکانہ ملتا سو رہتا، وہ عرصہ دراز سے گداگروں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ کبھی کبھار مائے جیک کو مٹھی بھر ننھے ننھے موتی لادیتا، جس کی عوض اسے ہر روز باسی ڈبل روٹی کے چند ٹکڑے، بچا کھچا شوربا اور گاہکوں کے گلاسوں سے بچی برانڈی دے دیا کرتا تھا۔ اس سودے میں مائے جیک کے وارے نیارے تھے۔ لیکن وہ بھی ایک ہی کائیاں تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کرسٹوفر یہ موتی خود کہیں سے نہیں لاتا تھا بلکہ کاراکی اس کی خاطر سمندر کی تہہ میں غوطہ لگا کر انہیں نکالتا تھا۔ اسے کرسٹوفر کو مفت

میں برانڈی دیتے کوفت ہوتی تھی۔ وہ تھوڑے سے تمباکو کے عوض کآراکی سے براہ راست لین دین کرنا چاہتا تھا، لیکن کاراکی عجیب اجڈ آدمی ثابت ہوا۔ مائے جیک کی تجویز کے جواب میں اس نے اسے بری طرح گھور کر دیکھا کہ ٹھگنا چینی تھرا کر رہ گیا۔ اس وقت سے وہ کآراکی سے خائف سا رہنے لگا تھا۔ تاہم وہ کھل کر اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ اس طرح موتیوں سے ہاتھ دھونے کا خدشہ تھا۔

کآراکی بوگین والے کے مردم خور قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اسے کسی طاقت ور سردار نے ایک تجارتی کمپنی کے ہاتھ تین سال کے لئے تمباکو اور کچھ رقم کے عوض فروخت کر دیا تھا۔ اس سودے بازی میں کاراکی کی خواہش اور منشا کو کوئی دخل نہ تھا۔ ان قبائل میں یہی دستور تھا۔ تین سال بعد اسے اپنے وطن لوٹ جانے کی اجازت تھی۔ اس جگہ بھی اس کی حیثیت ایک سامان ڈھونڈنے والے جانور سے زیادہ نہ تھی۔ سیاہ فام ہونے کی وجہ سے مقامی باشندے اسے ناپسند نہیں کرتے تھے، تاہم وہ اسے زیادہ اہمیت دینے پر امادہ نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی اور کرسٹوفر کی دوستی کو چھبنے کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ کآراکی چھوٹے سے قد کا جفاکش اور پھرتیلا نوجوان تھا۔ وہ خاموش تھا اور شاذ ہی کوئی بات کرتا سر پر چھوٹے چھوٹے گھنگھریالی بالوں کا جھنڈ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور دھنسی ہوئی تھیں۔ وہ ہر وقت کمر کے گرد ایک سرخ کپڑا باندھے رہتا تھا۔

آفتاب نصف النہار پر تھا۔ کاراکی اپنے ناریل کے پتوں سے بنے چھجے والی کٹیا میں بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ دفعتہً اس کے کانوں میں آواز آئی۔

"کہاں مر گیا کالیا! اپنے یار کو سنبھال آ کر، خرمستی کر رہا ہے"

اس کی نظر مائے جیک کی دکان پر پڑی۔ کرسٹوفر نشے میں دھت، ڈگمگاتا ہوا نکل رہا تھا۔ مائے جیک نے اسے سہارا دینے کے بجائے دھکیل دیا اور وہ لڑکھڑاتا ہوا زمین پر منہ کے بل گر پڑا کآراکی اٹھا اور اس کے قریب خاموشی سے

جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے جھک کر کرسٹوفر کے بازو اپنی پشت پر رکھے اور بچے کی طرح اٹھا لایا۔

وہ اسے کٹھیا میں لے آیا اور نہایت آہستہ سے چٹائی پر لٹا دیا۔ پھر وہ بالٹی میں پانی بھر لایا اور کرسٹوفر کے سر اور منہ کو دھونے لگا۔ کرسٹوفر اب بھی مدہوشی کی عالم میں تھا۔ کارا کی نے اس کا سر اور منہ ایک میلے کپڑے سے خشک کیا۔ پھر صندل کی کنگھی اس کے سر اور داڑھی میں پھیرنے لگا، ساتھ ہی وہ مکھیاں بھی اڑاتا جاتا تھا، جو کرسٹوفر کے منہ پر بھنبھنا رہی تھیں۔ آفتاب کی روپہلی کرنوں میں کرسٹوفر کے سر اور داڑھی کے بال سونے کے تاروں کی طرح دمک رہے تھے اور کارا کی کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مسرت اور اضطراب کے ملے جلے جذبات سے چمک رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی نظروں کے سامنے بیش بہا خزانہ ہے۔ اس کی حریصانہ نظریں کرسٹوفر کے بھورے بالوں پر گڑی تھیں۔

آفتاب دھیرے دھیرے سفر کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ساری فضا اونگھتی نظر آ رہی تھی، ہوا میں گرمی تھی اس وقت جزیرے بھر میں ہو کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ تجارتی کمپنی کا عملہ لکڑی کی بارکوں میں آرام کرتا اور مزدور بھی گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کر لیتے۔

جزیرہ سنسان تھا دور دور تک کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ مائے جیک کی دکان پر بھی الو بول رہا تھا۔ وہ بھی اپنی بوتلوں کے پیچھے، اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہوائیں جنوب مشرق کی سمت چل رہی تھیں جس سے سمندر کی لہروں کا رخ بدل گیا تھا۔ وہ مدت سے اس سنہری موقعے کا منتظر تھا، اسے اپنے خواب پورے ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھیں عزم سے چمک رہی تھیں۔

وہ اٹھا اور کٹیا سے باہر نکل آیا۔ اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور کمپنی کے دفتر کی

طرف بڑھا۔ دفتر خالی تھا۔ اس نے دیوار پر لٹکے ایک فریم کو ہٹایا۔ اس کے پیچھے ایک چھوٹا سا طاق تھا جس میں ایک بڑی سی کنجی رکھی تھی۔ کارا کی پہلے ہی ٹوہ لگا چکا تھا۔ وہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کام کر رہا تھا، کنجی لے کر وہ کمپنی کے گودام کی طرف بڑھا۔ دروازے پر لگا قفل کھل گیا تو وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا۔ گودام مختلف اشیاء سے بھرا پڑا تھا۔ اس کی متجسس نظروں نے چشم زدن میں ان کا جائزہ لیا اور اس کے ہاتھ تیزی سے کام کرنے لگے۔ پہلے تو اس نے تین قیمتی پردے، تمباکو کے دو ڈبے، چند چاقو اور ایک تیز دھار والی کلہاڑی منتخب کی، انہیں ایک طرف رکھا۔ پھر اس نے تین عمدہ رائفلیں اور کارتوسوں کی ایک پیٹی اٹھائی، انہیں بھی دوسرے مال غنیمت کے ساتھ رکھا اور کلہاڑی لئے دبے پاؤں گودام سے نکلا چند ثانیے وہ حالات کا جائزہ لیتا رہا پھر چپکے سے دفتر کی پشت پر پہنچا۔ اس جگہ کئی کشتیاں بندھی تھیں کارا کی نے کلہاڑی کی مدد سے ان کی تہہ میں شگاف کرنے شروع کئے۔ چند منٹوں میں ساری کشتیاں ناکارہ ہو چکی تھیں۔ اب اس کے چہرے پر اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ تقریباً دوڑتا ہوا سمندر کی طرف گیا۔ کنارے پر ایک بڑی سی کشتی لنگر انداز تھی۔ اس نے اس کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر دوڑتا ہوا دفتر میں پہنچا۔ تین پھیروں میں اس نے سارا سامان کشتی میں لاد دیا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ کٹیا میں پہنچا۔ کرسٹوفر ہنوز مدہوش تھا۔ کارا کی اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اسے ہلانے جلانے لگا۔ مسٹر او مسٹر، اٹھو، جلدی کرو، جلدی، الفاظ اس کے منہ سے ہمیشہ کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ کرسٹوفر ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ کارا کی نے ادھر اُدھر دیکھا اور چلو میں پانی لا کر اس کے منہ پر چھینٹے مارنے لگا۔ اس پر بھی کرسٹوفر نے جنبش نہ کی تو اس نے اسے پھر بازوؤں پر اٹھایا اور سمندر کی طرف لے چلا۔

کرسٹوفر کو کشتی میں لٹا کر وہ کٹیا میں آیا۔ چاول کی ایک بوری اور آلوؤں کا تھیلا اٹھایا اور گردوپیش پر نظر دوڑانے لگا۔ اس کی نظر پانی کے ڈرم اور بسکٹوں کے ڈبے پر پڑی۔ اس نے بوری سر پر اور تھیلا پشت پر رکھا۔ بسکٹوں کے ڈبے کے

کونے کو دانتوں سے پکڑا اور ڈرم ہاتھوں میں اٹھائے۔ کٹیا کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا۔

کشتی میں ان چیزوں کو رکھ کر اس نے چپو سنبھالے اور تیزی سے چلانے لگا۔ ہوا حسب توقع موافق تھی۔ کشتی سمندر کا سینہ چیرتی تیزی سے بہنے لگی۔ جزیرہ دور ہوتا جا رہا تھا اور کشتی سمندر کی کھلی آغوش میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ کاراکی نے صرف ایک مرتبہ پلٹ کر جزیرے کی طرف دیکھا اور ہمیشہ کے لئے منہ پھیر لیا۔ جزیرے میں کسی نے انہیں جاتے نہیں دیکھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ آفتاب سمندر کی گود میں منہ چھپانے کو تھا۔ شفق کی سرخی لہروں کے منہ پر غازہ مل رہی تھی۔ ہوا میں خنکی آگئی تھی۔ محیط پر سکوت کا تسلط تھا۔ صرف چپوؤں کی آواز اس سکوت کو توڑتی ہوئی زندگی کے آثار کا پتہ دے جاتی تھی۔ نامعلوم منزل کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اچانک کرسٹوفر بڑبڑایا اور کاراکی نے اس کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔ کرسٹوفر انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے آنکھیں ملتے ہوئے چاروں طرف دیکھا اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے چلایا،
کاراکی......!!

کاراکی نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنے دوست کی طرف گھمائیں اور منہ سے کچھ نہ بولا

"یہ سب کیا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ تم......" کرسٹوفر گلا پھاڑ کر چلایا۔

"مسٹر، خاموش رہو، کاراکی نے غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ تحکمانہ لہجے میں کہا، دوسرے ہی لمحے اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ پیار سے بولا۔

"کچھ کھا لو، تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔

"جہنم میں جاؤ" کرسٹوفر جھلایا۔ مجھے برانڈی چاہیے"

"برانڈی نہیں مل سکتی۔ کاراکی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"لیکن تم مجھے کہاں لئے جا رہے ہو؟ کرسٹوفر نے بے بسی سے کہا۔

"میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہا ہوں، کارا کی نے مختصراً جواب دیا اور تیزی سے چپو چلانے لگا۔

"لیکن آخر کیوں......؟ کرسٹوفر نے حیرانی سے پوچھا۔

تم یہاں بہت ذلیل ہو چکے ہو۔ کارا کی نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

کرسٹوفر غصے سے ہونٹ چبانے لگا۔ کارا کی لاپرواہی سے چپو چلاتا رہا۔ تاریکی تیزی سے بڑھتی آ رہی تھی۔ کرسٹوفر کو بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے لپک کر بسکٹوں کا ڈبہ اٹھایا اور اسے کھول کر بیک وقت تین بسکٹ کھانے ہی کو تھا کہ کارا کی بولا۔

"مسٹر تھوڑا تھوڑا کھاؤ، نہ جانے کتنی دن کا سفر ہو"

کرسٹوفر کا ہاتھ رک گیا اور وہ اسے گھورنے لگا۔ نیم تاریکی میں کارا کی کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ کرسٹوفر نے تین بسکٹ کھائے اور پانی پئے بغیر لیٹ گیا۔ کشتی چلتی رہی۔

کشتی رات بھر چلتی رہی۔ کرسٹوفر مزے سے سوتا رہا۔ کارا کی چپو چلاتا رہا۔ رات بیت گئی۔ آفتاب نے سمندر کی گود سے منہ نکالا اور دو بے یارو مددگار مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ایک سو رہا تھا، دوسرا جاگ رہا تھا۔ ایک کی آنکھیں بند تھیں دوسرے کی کسی انجانی مسرت سے چمک رہی تھیں۔ اس نے جب اپنی گرم گرم کرنیں بند آنکھوں پر پھینکیں تو وہ کھل گئیں۔

کرسٹوفر پہلے تو آنکھیں کھولے حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کی سمجھ سے بالاتر بھی تھا اور دسترس سے باہر بھی۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور استفہامیہ نظروں سے کارا کی کو دیکھنے لگا۔

"آلو میٹھے ہیں کھالو"۔ کارا کی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

''مجھے برانڈی چاہیے۔'' کرسٹوفر نے پھر مطالبہ دہرایا۔

کارا کی نے چپو ہاتھ سے رکھ دیئے۔ چاقو اٹھایا اور ایک ناریل چھیلنے لگا۔ پھر اس نے اس میں سوراخ کیا اور کرسٹوفر کی طرف بڑھا دیا۔ کرسٹوفر نے ناریل منہ سے لگا لیا۔ اس کا پانی پی کر اسے تسکین محسوس ہوئی، گویا نشہ آ گیا، اس نے مسکرا کر کارا کی کو دیکھا اور وہ بھی مسکرانے لگا۔

''ہم کب تک تمہارے گھر پہنچ جائیں گے'' اس نے دوستانہ رویہ اختیار کر لیا۔

''معلوم نہیں'' کارا کی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ کرسٹوفر مایوسی سے سمندر کی طرف دیکھنے لگا۔ دن چڑھ گیا تھا۔ پھر دوپہر ہوگئی اور اس کے بعد شام۔ اس تمام عرصے میں کارا کی بلا تکلف چپو چلاتا رہا۔ کرسٹوفر کتنے ہی آلو کھا گیا اور کئی خالی ناریل پانی میں پھینک دیئے۔ اسے خیال تک نہ آیا کہ کارا کی نے بھی کچھ کھایا ہے یا نہیں۔ پیاس اسے بھی لگ سکتی ہے، وہ چپو چلا چلا کر تھک بھی سکتا ہے۔

رات ہوگئی اور کرسٹوفر سو گیا۔ کشتی رات بھر چلتی رہی۔ صبح کرسٹوفر کی آنکھ کھلی تو کشتی ایک چٹان سے بندھی کھڑی تھی۔ کارا کی غائب تھا۔ اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ کشتی ایک ویران جزیرے کے کنارے تھی۔ وہ اتر کر زمین پر آیا اور چاروں طرف دیکھنے لگا۔ ایک جگہ دھواں اٹھتا نظر آیا۔ وہ اس طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ کارا کی مچھلی آگ پر بھون رہا ہے۔ خوشبو سے کرسٹوفر کی اشتہا چمک اٹھی۔ وہ چشم زدن میں مچھلی چٹ کر گئے۔

''کارا کی تمہیں اندازہ بھی ہے کہ تمہارا گھر کس طرف ہے''۔ کرسٹوفر نے شفقت سے کہا۔

جواب میں کارا کی نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا اور منہ سے کچھ نہ بولا۔ دونوں چپ چاپ کشتی میں آ بیٹھے اور کارا کی نے چپو سنبھال لئے۔

دوسرا دن بھی گزر گیا۔ تیسرا دن بھی اور چوتھا بھی۔ بسکٹوں کا ڈبہ تو پہلے ہی

دن خالی ہو چکا تھا۔ آلوؤں کا تھیلا بھی خالی ہوگیا۔ کرسٹوفر نے کچے چاول چبانے شروع کیے، لیکن پیٹ میں اس شدت کا درد محسوس ہوا کہ اس نے کچے چاول کھانے سے توبہ کرلی۔۔ لے دے کر ناریل رہ گئے تھے وہ بھی دو چار۔ کرسٹوفر ان ہی پر گزارہ کر رہا تھا۔ لیکن کارا کی انہیں چھوتا بھی نہ تھا۔ بسکٹ اور آلو بھی کرسٹوفر تنہا کھا گیا تھا۔ اس نے کارا کی سے جب بھی کھانے کو کہا وہ انکار کرتا رہا۔ کرسٹوفر کو حیرت تھی کہ کچھ کھائے پیئے بغیر وہ اتنی مشقت کس طرح کرتا ہے۔ اس کا تو یہ حال تھا کہ مکمل فاقہ نہ ہونے کے باوجود نقاہت کے مارے ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت اسے شراب چھٹ جانے سے ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ مرتے دم تک شراب چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ کسی دن اگر اسے ایک آدھ گھونٹ نہ ملتا تو اس کا دل خودکشی کر لینے کو چاہتا۔ لیکن اب کئی دن ہو چکے تھے، وہ شراب کی قطعاً حاجت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ یہ کیسا انقلاب آ گیا تھا؟ اسے شراب کی جگہ ناریل کے پانی میں وہ لطف آ رہا تھا کہ وہ بیان نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس لعنت سے نجات مل گئی جس کی وجہ سے محض ذلت اور رسوائی تھی۔ وہ اسے کارا کی کا احسان سمجھ رہا تھا کہ اس نے اسے خدا کی اس نعمت سے بہرہ ور کرایا۔ اس کی دل میں کارا کی کا درجہ کئی گنا بلند ہوگیا۔

اب ناریل بھی ختم ہوگئے تھے۔ دُور دُور تک کوئی زمین نظر نہ آتی تھی۔ کارا کی نے سمندر کی نمکین پانی میں چاول ابالے اور کرسٹوفر کو کھلا دیئے، خود اس نے ایک دانہ بھی نہ چھوا۔ ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ لیکن کارا کی کے عزم واستقلال میں بال برابر بھی فرق نہ آیا تھا۔ کرسٹوفر اس کی بلند حوصلگی پر عش عش کر رہا تھا۔ وہ اسے اس

وقت دنیا کا بلند ترین انسان سمجھ رہا تھا، جو خود بھوکا رہ کر اسے زندہ رکھ رہا تھا۔ کاش وہ اس احسان عظیم کا بدلہ چکا سکتا، لیکن وہ تو زندگی سے ناامید ہو چلا تھا۔ منزل کا نام ونشان نظر نہ آتا تھا، اسے یقین ہو چلا تھا کہ کارا کی خود بھوکا رہ کر اسے چاول کھلا سکتا ہے۔ لیکن اسے موت کے منہ سے بچا نہیں سکتا۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ دوستی

کا کون سا مقام ہے، وہ کارا کی کے اس جذبے کو کیا نام دے؟ کیا یہ جذبہ کسی اور انسان میں بھی ہو سکتا ہے؟ وہ سوچ میں غلطاں تھا کہ کارا کی چلا اٹھا"۔ مسٹر، وہ دیکھو" اور کرسٹوفر نے اس کی انگلی کی سیدھ میں بہت سے پرندوں کو منڈلاتے دیکھا۔

"وہ زمین ہے"

کارا کی خوشی سے بولا اور کرسٹوفر کی جان میں جان آئی۔ کارا کی تیزی سے چپو چلانے لگا۔ زمین کو دیکھتے ہی اس کے بازوؤں میں بلا کی طاقت آ گئی تھی۔ کرسٹوفر نے سوچا کہ اگر وہ اس کی جگہ ہوتا تو متواتر فاقوں سے کب کا راہیٔ ملک عدم ہو چکا ہوتا۔ وہ بے چینی سے پرندوں کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد اسے بھی زمین نظر آ ہی گئی۔ اور وہ مارے خوشی کے لہک لہک کر گانے لگا، اس کی بے سُری آواز پانی کی لہروں کو بھی شاق گزر رہی ہو گی۔ کیوں کہ وہ سست رفتاری سے بہنے لگی تھیں۔ تاہم اس سست رفتاری سے کارا کی بے حد خوش تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جوں جوں ساحل قریب آتا ہے لہریں سست پڑتی جاتی ہیں۔

اچانک وہ چلایا۔ میرا گھر، میرا گھر، اس نے چپو پھینک دیئے اور کھڑا ہو گیا کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ کرسٹوفر نے لپک کر چپو سنبھال لئے اور الٹے سیدھے ہاتھ مارنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ کارا کی کی مسرت عین فطری ہے، اسے غلامی سے نجات پانے اور منزل ملنے کی دوہری خوشی ہو رہی ہے۔ وہ پر اشتیاق نظروں سے ساحل کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتہً کارا کی نے اس کے ہاتھ سے چپو لے لئے اور کشتی کا رخ موڑنے لگا۔ کشتی ساحل کی سمت بڑھنے کے بجائے اس کے متوازی چلنے لگی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟ کرسٹوفر نے جھلا کر کہا۔

"خاموش رہو مسٹر۔ کارا کی نے درشتی سے کہا اور کرسٹوفر دبک گیا۔

کشتی کچھ دیر اسی طرح چلتی رہی۔ جزیرے کی جھونپڑیاں صاف نظر

آ رہی تھیں۔ کہیں کہیں دھواں اٹھ رہا تھا۔ کارا کی نے کشتی کا رخ اس سمت کیا، جہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ کچھ دیر بعد کشتی ساحل سے لگ چکی تھی۔ دونوں اتر کر زمین پر کھڑے ہوگئے۔ کارا کی نے کشتی کو ایک بڑے سے پتھر سے باندھ دیا۔ کرسٹوفر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔

جزیرہ سرسبز و شاداب تھا، پرندے چہچہا رہے تھے اور فضا رومانی ہو رہی تھی۔ کرسٹوفر کے دل میں امنگیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ وہ خوشی سے ناچنے لگا اور بے ڈھنگے پن سے ناچتا رہا، اچانک اسے کارا کی کا خیال آیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس پر اپنے وطن پہنچنے کا کیا ردعمل ہوا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا تو وہ ہاتھ میں کلہاڑی لیے کھڑا تھا اور اسے گھور رہا تھا۔ اسے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر کرسٹوفر کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"کیا دیکھ رہے ہو جانِ من؟" اس نے شگفتگی سے کہا۔ کارا کی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"مسٹر مجھے تمہارا سر چاہیے۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"میرا سر، خوب، یہ رہا، جناب کی خدمت میں حاضر ہے۔ کرسٹوفر نے اداکارانہ انداز میں سر جھکا کر کہا۔ وہ بدستور ہنس رہا تھا۔

کارا کی کلہاڑی لیے آگے بڑھا اور چشم زدن میں کرسٹوفر کا سر خاک و خون میں لوٹ رہا تھا۔ اس کا جسم زمین پر تڑپ رہا تھا اور مٹی خون سے سرخ ہوگئی تھی۔ کرسٹوفر کو علم نہ تھا کہ کارا کی نے اس سے دوستی محض اس کی سر کے لیے کی تھی۔ وہ اپنی جان پر کھیل کر اسے فوفوٹی سے نکال لایا تھا۔ خود بھوکا پیاسا رہ کر اس کی جان کی حفاظت کرتا رہا تھا۔ اس کے قبیلے میں ایک سفید فام آدمی کے سر سے زیادہ قیمتی دولت اور کچھ نہ سمجھی جاتی تھی۔ جس شخص کی پاس یہ ہوتا اسے قبیلے کا سردار منتخب کرلیا جاتا۔ عورتیں اس پر پروانہ وار نثار ہوتیں اور بھورے بالوں والے سر کی تو کوئی قیمت

ہی متعین نہ کی جاسکتی تھی۔ کاراکی کو معلوم تھا کہ تین سالہ غلامی کے بعد بھی وطن لوٹنے پر اس کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہ ہوگی، اسے پھر تمبا کو اور چند سکوں کے عوض کسی اور جگہ فروخت کر دیا جائے گا، اسی لئے اس نے کرسٹوفر سے دوستی کی۔ اس کی خاطر سمندر میں غوطہ لگا کر موتی لاتا رہا تھا۔ تاکہ وہ زندہ رہے۔ وہ دل ہی دل میں منصوبہ بنا رہا تھا اور آج اس منصوبے کی تکمیل ہوگئی تھی۔

☆☆☆☆

بُڑھیا کا انتقام

(مقبول جہانگیر)

قصبہ بونی فیسیو کے آخری کنارے پر، الگ تھلگ ایک عمر رسیدہ بیوہ عورت اپنے نوجوان لڑکے کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ ان کا چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا مکان پہاڑی کے ساتھ ہی بنا ہوا تھا، جس میں آرام و آسائش کی کوئی چیز نہیں تھی۔ یہاں شب و روز بحری ہوائیں چلتی رہتی تھیں۔ بونی فیسیو کے ماہی گیر انہی طوفانوں میں اپنی کشتیاں لے کر سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاتے تھے۔ دور سمندری چٹانوں کے پیچھے ایک دھبے کی مانند جزیرہ سارڈینیا دکھائی دیتا تھا۔ بڑھیا سیورنی کا مکان چونکہ ایک بلند پہاری ٹیلے پر تھا۔ اس لئے وہاں سے سارڈینیا کی خوبصورت برفانی پہاڑیاں اور ان پر بنے ہوئے اکا دُکا مکانات صاف نظر آتے تھے اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا، جیسے یہ مکان پرندوں کے چھوٹے چھوٹے گھونسلے ہیں۔ بڑھیا سیورنی کے مکان کی تین کھڑکیاں سارڈینیا کی طرف کھلتی تھیں اور کبھی کبھار وہ وہاں بیٹھی اس جزیرے کی طرف خواب آلودہ نگاہوں سے دیکھتی رہتی تھی۔ جہاں آسمان اور سمندر ایک دوسری سے گلے ملتے ہوئے نظر آتے تھے۔

اس کے بیٹے کا نام انتونی تھا۔ وہ نہایت صحت مند اور خوبصورت جوان تھا۔ دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ اس مختصر سے گھر میں ان کے علاوہ ایک تیسرا فرد اور بھی تھا اور وہ ان کی پالتو کتیا تھی۔ جس کا قد لمبا، جسم دبلا پتلا اور پنجے کافی تیز اور نوکیلے تھے۔ وہ شکاری کتیا تھی اور کبھی کبھار نوجوان انتونی کے ساتھ شکار کی مہم پر جایا کرتی تھی۔

ایک اداس شام کا ذکر ہے، نوجوان انتونی کا کسی بات پر ایک شخص

نکولس سے جھگڑا ہو گیا۔ نکولس قصبہ بونی فیسیو کا بدمعاش تھا۔ اس نے مشتعل ہو کر لمبا چاقو نکالا اور انتونی کے سینے میں گھونپ دیا اور پھر لڑکے کی تڑپتی ہوئی لاش کو وہیں چھوڑ کر اسی رات سارڈینیا کی طرف بھاگ گیا۔ انتونی کی لاش رات بھر اسی پہاڑی درے میں پڑی رہی...... وہاں شاذونادر ہی کسی کا گزر ہوتا تھا۔ اتفاقاً چند ماہی گیر ادھر سے گزرے اور انہوں نے پہچان لیا کہ لاش بڑھیا سیورنی کے بیٹے انتونی کی ہے۔ وہ لاش کو بڑھیا کے مکان پر لے آئے۔ بڑھیا نے اپنے بیٹے کی لاش دیکھی اور دیکھتی ہی رہی...... نہ اس کا جسم کانپا، نہ اس نے چیخ ماری اور نہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا ہوئی...... وہ بس چپ چاپ، خاموش، پھٹی پھٹی نظروں سے اپنے پیارے بیٹے کی لاش دیکھتی رہی پھر اس نے اپنا جھریوں والا ہاتھ آگے بڑھا کر اپنے بیٹے کے سینے پر رکھا اور قسم کھائی کہ وہ اس خون کا انتقام لے گی...... اس نے ماہی گیروں اور دوسرے لوگوں کو، جو اس سے ہمدردی کرنے آئے تھے، اپنے مکان سے چلے جانے کا اشارہ کیا..........

جاؤ.......... تم سب یہاں سے چلے جاؤ...... مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں...... تم میرا بیٹا مجھے واپس نہیں دے سکتے...... اس لئے جاؤ...... مجھے اکیلا چھوڑ دو...... میں اپنے بیٹے سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں......

کسی نے کچھ نہ کہا...... لوگ سمجھے کہ بڑھیا سیورنی کا دماغ چل گیا ہے۔ ان سب کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہرے سوگوار...... جب سب چلے گئے تو بڑھیا نے مکان کا دروازہ بند کیا اور انتونی کی لاش کے قریب بیٹھ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی...... کتیا اپنے مرے ہوئے آقا کے سرہانے بیٹھی تھی...... اس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ اس نے کئی مرتبہ محبت سے انتونی کے سر پر اپنا پنجہ رکھا۔...... وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید اس کا آقا سو رہا ہے۔ لیکن وہ اس سے پہلے تو کبھی اس وقت نہیں سویا...... اس نے منہ اٹھا کر بڑھیا سیورنی کی

طرف دیکھا، جس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا...... کتیا کو احساس ہوا کہ اس کا آقا مر چکا ہے۔ اس کی حلق سے ایک لمبی اور دلدوز آواز نکلی جس سے سارا مکان گونج اٹھا اور بڑھیا کو یوں معلوم ہوا جیسے انتونی کی موت پر مکان کے درو دیوار بھی رو رہے ہیں۔ کتیا کی رونے کی آواز مکان کے باہر کھڑی ہوئی چند عورتوں نے بھی سنی اور وہ سسکیاں بھرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔...... بے چارہ انتونی...... اس کی عمر ہی کیا تھی...... زندگی کی صرف بیس بہاریں اس نے دیکھیں اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے اسے دبوچ لیا۔

انتونی کی لاش بستر پر پڑی تھی...... اس کا بھورے رنگ کا پرانا کوٹ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ سر کے بال نچے ہوئے تھے۔ اس کا سارا جسم، سینہ، گردن، بازو اور ٹانگیں جمے ہوئے خون سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ لیکن اسے دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مر چکا ہے، بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں بند کئے آرام کی نیند سو رہا ہے۔

روتے روتے یکایک بڑھیا چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھیں اپنے بیٹے کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں اور لب کپکپا رہے تھے۔ شاید وہ کچھ چاہتی تھی...... اور پھر اس کی زبان سے چند جملے ادا ہوئے...... کتیا نے جونہی مالکہ کی آواز سنی وہ بھی خاموش ہو کر اس کا منہ تکنے لگی، جیسے سمجھنا چاہتی ہو کہ مالکہ کیا کہہ رہی ہے......

"آہ! میرے پیارے بیٹے، تم سو رہے ہو...... سو جاؤ...... خوب آرام سے سو جاؤ...... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟ میں تمہاری ماں بول رہی ہوں بیٹے،...... تمہاری ماں...... جس سے تمہیں بڑا پیار تھا...... اور جس کا حکم تم نے کبھی نہیں ٹالا...... میں وہی تمہاری ماں ہوں...... اور تمہارے سامنے عہد کرتی ہوں کہ تمہارے خون کا بدلہ ضرور لوں گی۔...... اب تم اطمینان سے سو جاؤ......"

یہ کہہ کر وہ انتونی کی لاش پر جھکی اور اپنے سرد اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اس کی خون آلود پیشانی چوم لی۔ بڑھیا جونہی چپ ہوئی کتیا کے حلق سے رونے کی مہیب آواز نکلی پر اس نے اپنا منہ زمین میں چھپالیا اور چپکی ہوگئی۔ اور اس طرح وہ رات بوڑھی سیورنی اور کتیا سیمی لینتی نے انتونی کے قریب بیٹھ کر روتے دھوتے گزار دی۔

دوسرے روز انتونی کو قصبہ بونی فیسیو کی چھوٹے سے گرجے کے قبرستان مین دفن کر دیا گیا چند روز تک نوجوان کی دردناک موت کا چرچا لوگوں میں ہوا اور پھر سب بھول بھال گئے، سوائے اس کی ماں اور اس کی کتیا کے جو اس کی موت کے غم کو سینے سے لگائے ہوئے تھیں۔

بڑھیا کے شب و روز اسی فکر میں گزرنے لگے کہ انتقام لینے کی صورت کیا ہو...... اسے اتنا پتہ چل چکا تا کہ جس شخص نے اس کے بیٹے کو مارا ہے وہ سارڈینیا کے ایک گاؤں لونگو سارڈو میں چھپا ہوا ہے۔ یہ گاؤں کار سکین بدمعاشوں اور غنڈوں کو پناہ دینے کے لئے بڑا مشہور تھا اور اکثر جرائم پیشہ لوگ انصاف کے ہاتھ سے بچنے کے لئے لونگو سارڈو میں پناہ لیا کرتے تھے۔

بڑھیا سیورنی نہ کسی سے بات کرتی اور نہ کہیں آتی جاتی، بلکہ مکان کی پچھلی کھڑکیوں میں سے ایک میں بیٹھ کر سارا سارا دن لونگو سارڈو کی جانب گھورا کرتی، جہاں اس کے بیٹے کا قاتل چھپا ہوا تھا۔ غصے سے اس کے بدن کا رواں رواں کانپنے لگتا اور آنکھیں اشک بار ہوجاتیں۔ اس کی سمجھ میں بدلہ لینے کی کوئی تدبیر نہ آتی تھی۔ وہ نحیف و ناتواں عورت تھی۔ اس کا کوئی مددگار نہ تھا۔ وہ کسی سے صلاح مشورہ بھی نہیں لے سکتی تھی۔ اسے تو اتنا بڑا کام تن تنہا پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔ وہ اپنے بیٹے سے وعدہ کر چکی تھی۔ اس کی لاش کے آگے سینے پر ہاتھ رکھ کر انتقام لینے کی قسم کھائی تھی...... اسے اب تاخیر نہیں کرنی

چاہیے کیا معلوم موت کا ظالم ہاتھ کب اسے بھی پکڑ لے اور اپنے ساتھ لے جائے...... پھر وہ اپنا قول کیونکر پورا کرے گی؟ اسی فکر میں اسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ ساری رات اپنی چھوٹی سی کوٹھڑی میں ٹہلا کرتی یا تھک کر کھڑکی کے پاس بیٹھ جاتی۔ اسے کسی کل چین نہ پڑتا تھا۔ کتیا سایے کی مانند اپنی مالکن کے ساتھ ساتھ رہتی، اب اس میں بھی وہ پہلی سی شوخی اور چلبلا پن نہ رہا تھا۔ وہ شاذونادر ہی بھونکتی، بس اپنی مالکہ کے پیروں تلے پڑی سویا کرتی یا دل چاہتا تو اونچی آواز میں دو تین مرتبہ رونے کی آواز نکالتی اور چپ ہو جاتی...... شاید وہ اپنے آقا کو ڈھونڈتی اور پکارتی تھی۔

ایک رات جب کہ کتیا اسی طرح اپنے آقا کی یاد میں رو رہی تھی۔ بڑھیا کے ذہن میں انتقام لینے کی ایک انوکھی تدبیر آئی...... نہایت کارگر اور نہایت وحشیانہ تدبیر...... وہ ساری رات اسی تدبیر کے مختلف پہلوؤں پر سوچ بچار کرتی رہی اور اسے یقین ہو گیا کہ اگر اس پر عمل کیا جائے تو وہ قاتل سے خاطر خواہ بدلہ لے سکتی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ مکان سے باہر نکلی اور گرجے میں جا کر قربان گاہ کے سامنے سجدے میں گر پڑی اور خدا سے رو رو کر اپنی کامیابی کی دعائیں مانگنے لگی۔ گرجے سے واپس آ کر اس نے کتیا کو صحن میں باندھ دیا اور اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔ اس کی نگاہیں سارڈینیا کے ساحل پر گڑی ہوئی تھیں۔

اس روز کتیا سارا دن اور ساری رات بھوکی پیاسی صحن میں بندھی رہی۔ پہلے تو وہ کافی دیر تک چپ چاپ پڑی رہی، لیکن جب اسے بھوک ستانے لگی تو اس نے بھونک بھونک کر سارا مکان سر پر اٹھا لیا، مگر بڑھیا سیورنی اپنی کوٹھڑی سے باہر نہ نکلی اور نہ اس نے کتیا کو کچھ کھلایا پلایا...... اس سے اگلے روز صبح وہ کوٹھڑی سے برآمد ہوئی، اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ تھا وہ اس نے کتیا کے سامنے رکھ دیا۔ کتیا نے پانی پیا اور محبت سے دم ہلائی اور اب وہ روٹی یا گوشت کے چند لوتھڑوں کی منتظر تھی۔ مگر بڑھیا نے سارا دن

کھانے کے لئے اسے کچھ نہ دیا۔ اب کتیا بھوک سے اس قدر نڈھال ہو چکی تھی کہ اس میں بھونکنے کی سکت بھی باقی نہ رہی۔ وہ آنکھیں بند کئے پڑی رہی رات کے وقت جب اسے پھر بھوک نے ستایا تو وہ بھونکی اور زنجیر تڑانے کی کوشش کرنے لگی، لیکن زنجیر مضبوط تھی، ٹوٹ نہ سکی۔

دوسرے روز صبح بھی بڑھیا نے کتیا کو پانی ہی پلایا اور کھانے کے لئے کچھ نہ دیا...... اس نے کتیا کے چہرے پر مایوسی اور حیرت کے ملے جلے تاثرات پہچان لئے...... اپنی مالکہ کو دیکھتے ہی وہ زور زور سے اچھلنے اور زنجیر سے آزاد ہونے کی سعی کرنے لگی، لیکن اسے کھانے کو پھر بھی کچھ نہ ملا اور وہ سارا دن بھوکی رہی...... تیسرے روز بڑھیا سیورنی اپنے ایک پڑوسی کے گھر گئی اور وہاں سے دو گٹھڑیاں خشک گھاس اور بھس کی اٹھا لائی۔ پھر اس نے لکڑی کا ایک پرانا صندوق کھولا اور اس میں سے اپنے مرحوم شوہر کے کپڑے نکالے...... اور ان کپڑوں میں بھس بھر دیا۔ اس کے بعد بڑھیا نے بھس بھرے ہوئے کپڑوں کے اس انسانی ڈھانچے کو صحن میں ایک اونچی سی لکڑی گاڑ کر اس کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ پھر پرانی لینن کو لپیٹ کر اس ڈھانچے کا سر بنایا اور اس میں بھس بھر کے ڈھانچے کی گردن مکمل کر دی......

کتیا حیرت سے یہ سب تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ مالکہ کو کیا ہو گیا ہے، اس سے پہلے تو اس نے کبھی اسے بھوکا نہیں رکھا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر بڑھیا بازار گئی، قصاب کی دکان سے اس نے کلیجی خریدی اور گھر آ گئی۔ پھر صحن ہی میں بھوکی کتیا کے سامنے اس نے آگ جلائی اور کلیجی بھوننے لگی۔ کلیجی کی خوشبو جب کتیا کی ناک تک پہنچی تو اس کی بے قراری اور بے چینی کی حد نہ رہی۔ اس کا منہ کھلا ہوا اور آنکھیں گوشت پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر بڑھیا نے کلیجی کو ایک ڈوری میں پرویا اور بھس بھرے ہوئے

ڈھانچے کی گردن پر لپیٹ دیا۔ اس کے بعد وہ کتیا کی طرف گئی اور اس کی گردن سے زنجیر اتار دی۔

بجلی کی مانند بھوکی شکاری کتیا اس ڈھانچے کی طرف جھپٹی اور اپنے نوکیلے پنجے سے اس کی گردن پر وار کیا اور پھر اپنے دونوں پنجے اس کے کندھوں پر گاڑ کر دانتوں سے کلیجی کی بوٹیاں نوچنے لگی، لیکن اس کا منہ وہاں تک بمشکل پہنچ پایا۔ وہ پیٹھ کے بل زمین پر گری، لیکن پھر اٹھی اور ڈھانچے پر جھپٹی۔ کتیا کے غیظ وغضب کی انتہا نہ تھی۔ چند ہی لمحوں میں اس نے ڈھانچے کی گردن، شانے، بازو اور سینہ سب نوچ ڈالے اور کلیجی کا ایک ایک ٹکڑا ہڑپ کر گئی۔ بڑھیا سیورنی صحن کے ایک گوشے میں کھڑی اطمینان سے یہ دلچسپ تماشا دیکھتی رہی۔ پھر اس کی آنکھوں میں چمک اور لبوں پر تبسم کی خفیف سی لہر نمودار ہوئی کتیا کلیجی کھا کر اور ڈھانچے کو تہس نہس کر کے جب فارغ ہوئی تو بڑھیا نے اسے زنجیر سے باندھ دیا۔

اس کے بعد دو روز تک کتیا کو پھر فاقے سے رکھا گیا۔ اس دوران میں بڑھیا نے بھس کا انسانی ڈھانچہ تیار کیا اور کلیجی اس کی گردن سے باندھ کر کتیا کو چھوڑ دیا...... اس مرتبہ کتیا نے پہلے سے بھی زیادہ خونخواری اور جوش وخروش کا مظاہرہ کیا اور آناً فاناً اپنے نوکیلے پنجوں اور لمبے لمبے دانتوں سے اس کے چیتھڑے اڑا دیئے۔ تین ماہ تک بڑھیا نے ہر تیسرے روز یہی عجیب تماشا اپنے گھر میں کیا اور کتیا کو اس حد تک سدھایا کہ وہ اب محض اشارے ہی پر اس ڈھانچے کی طرف جھپٹتی اور اس کی تکا بوٹی کر ڈالتی...... اسے اب زنجیر سے باندھے رکھنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ اب ایسا ہونے لگا کہ کتیا اس کام سے فارغ ہوتی تو کلیجی اسے بعد میں انعام کے طور پر کھلائی جاتی تھی۔ ڈھانچہ جب دوبارہ بنایا جاتا تو کتیا ایک گوشے میں بیٹھی اسے وحشیانہ انداز میں تکتی رہتی اور جونہی بڑھیا کی انگلی کا اشارہ ملتا، وہ اپنی جگہ سے اچھلتی اور ڈھانچے پر پل

پڑتی۔ جب بڑھیا کو کتیا پر پورا اعتماد ہوگیا تو ایک روز صبح سویرے اس نے پرانے صندوق میں سے اپنے مرحوم شوہر کے کپڑوں کا ایک اور جوڑا نکالا اور اسے خود پہن لیا، کلیجی لے کر ایک تھیلے میں رکھی اور پھر کتیا کو ساتھ لے کر ساحل سمندر کی طرف چل پڑی...... اس کی چال ڈھال اور آواز سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بوڑھا آدمی ہے۔ اس نے ایک ماہی گیر سے کہا کہ اسے لونگو سارڈو پہنچا دے۔ کتیا کو اس نے اس مرتبہ دو دن کے فاقے سے رکھا۔ کشتی میں بیٹھنے کے بعد اس نے تھیلے کا منہ ذرا سا کھولا۔ کلیجی کی خوشبو جب کتیا کی ناک میں گئی تو وہ اچھلنے اور اسے جھپٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑھیا نے اس کی گردن پر تھپکی دی اور آہستہ سے کہا۔

نہیں...... ابھی اس کا وقت نہیں آیا...... ذرا اور صبر کرو......

لونگو سارڈو پہنچ کر وہ ایک شراب خانے میں گئی، وہاں اس نے نکولس کے بارے میں پوچھا کہ کہاں ملے گا...... کسی نے بتایا کہ نکولس بڑھئی اپنی دکان میں کام کر رہا ہے۔ بڑھیا اس دوکان کا پتہ دریافت کر کے وہاں آسانی سے پہنچ گئی...... اس نے آہستہ سے دوکان کا دروازہ کھولا۔ دوکان کے پچھلے حصے میں کوئی شخص ہتھوڑے سے لکڑی پر کیلیں ٹھونک رہا تھا۔ بڑھیا بلند آواز سے بولی۔

"نکولس...... کیا تم یہاں موجود ہو......

دوسرے ہی لمحے ایک لمبا تڑنگا ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "ہاں...... میرا ہی نام نکولس ہے، کہو کیا کام ہے۔

یہ سنتے ہی بڑھیا نے کتیا کی گردن سے زنجیر کھولی اور چلا کر کہنے لگی

پکڑ لو اسے...... پکڑ لو اسے......

شکاری کتیا جو پہلے ہی سے اس فن میں طاق ہو چکی تھی۔ ایک بلا کی مانند نکولس کی طرف جھپٹی اور اس کے گلے پر اپنا زبردست پنجہ مارا۔ نکولس

بدحواس ہوکر پیچھے گرا۔ اس اثناء میں کتیا نے اس کے منہ پر پنجے مارے اور اپنے لمبے دانت اس کے گلے میں گاڑ دیئے۔ نکولس کے منہ سے چیخ بھی نہ نکل سکی۔ چند منٹ تک وہ کتیا کے پنجے سے آزاد ہونے کی کوشش کرتا رہا، لیکن بے سود، کتیا نے اس وقت تک اسے نہ چھوڑا، جب تک اس کا دم نہ نکل گیا۔

دوکان کے سامنے مکان کے باہر دو پڑوسی سڑک پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بعد میں ذکر کیا کہ نکولس کی دوکان میں ایک بوڑھے کو سیاہ رنگ کی کتیا کے ساتھ جاتے دیکھا گیا اور جب وہ دکان سے باہر نکلے تو بوڑھے نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کوئی سیاہ سی چیز کتیا کو کھلائی تھی۔

تین ماہ بعد...... وہ پہلی رات تھی جب بوڑھی سیورنی گھر میں پیر پھیلا کر آرام سے میٹھی نیند سوئی......

☆☆☆

ہاتھیوں کے بھوت

(مقبول جہانگیر)

آپ شاید یقین نہ کریں، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بچپن سے لے کر میرے بال سفید ہونے تک مجھے روحوں کو دیکھنے کے متعدد مواقع ملے ہیں۔ زندگی کے اس طویل ترین سفر میں میں جہاں بھی گیا۔ ان سے سابقہ پڑتا رہا۔ انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ تاہم ان سے ملاقات کے واقعات اتنے دلچسپ اور عجیب وغریب ہیں کہ میں انہیں قلم بند کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

میری پیدائش کلکتے میں ہوئی...... ہمارا گھر شہر سے باہر جنگل کے سرے پر واقع تھا، جہاں رات کو بے شمار گیدڑوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ ان آوازوں کو سن کر ہم دونوں بھائی اکثر ڈر جایا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گیدڑ کسی کی موت پر بین کر رہے ہیں۔ گاؤں کے توہم پرست دیہاتی کہا کرتے تھے، گیدڑوں کی ان ماتمی آوازوں کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرنے والوں کی روحوں کو بلا رہے ہیں۔ ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر کھلے میدان میں چند بوسیدہ اور پرانے مکانات تھے جن میں دیہاتی لوگ رہا کرتے تھے۔ گرمیوں کے دنوں میں میں اور میرا بھائی باہر برآمدے میں سویا کرتے تھے اور وہاں سے ہم ان دیہاتیوں کو اپنے کاموں میں مصروف دیکھتے رہتے۔

ایک دن دفعتہً میری آنکھ کھلی...... میں نے قریب ہی جنگل کی طرف سے فائروں کی آوازیں سنیں...... پھر گھوڑا گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی چند آدمیوں کا شور......اور پھر چیخنے چلانے کی آوازیں...... میں نے فوراً اپنے بھائی کو جگایا۔ اس نے قطعاً کوئی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ کہنے لگا کہ ضرور میں نے کوئی ڈراؤنا

خواب دیکھا ہے.....تھوڑی دیر بعد مطمئن ہو کر ہم دونوں سو گئے۔

دوسرے روز صبح میں نے والد صاحب سے رات کے وقت بلند ہونے والے شور وغل کا ذکر کیا اور پوچھا کہ انہوں نے تو کوئی آواز نہیں سنی: وہ خاموشی سے میری بات سنتے رہے، میں نے دیکھا کہ کئی بار والد اور والدہ صاحبہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا..... جب میں بات ختم کر چکا تو والدہ نے کہا۔

کل تو وہی تاریخ تھی.....''

وہی تاریخ.....میں نے حیرت سے پوچھا۔تب والد صاحب نے مجھے سارا قصہ سنایا کہ گذشتہ سال اسی تاریخ کو عین آدھی رات کے وقت انہوں نے جنگل میں بالکل ایسا ہی شور وغل سنا تھا۔بڑی عجیب بات تھی۔والد صاحب نے اپنے بعض دوستوں سے اس پر اسرار واقعے کا تذکرہ کیا اور سب نے مل کر چھان بین کی تو ایک انتہائی حیران کن انکشاف ہوا۔جس پر یقین کرنے کو آج بھی دل چاہتا۔لیکن مشاہدات کی موجودگی میں انکار کرنے کی جرات بھی نہیں ہوتی۔

بتایا گیا کہ ''تیس برس پہلے عین اس مقام پر جہاں اب کھلے میدان ہیں مکانات بنے ہوئے تھے۔ایک خوبصورت لڑکی رہا کرتی تھی جس سے دو نوجوان محبت کرتے تھے۔لڑکی نے ان میں سے ایک کو پسند کر لیا اور شادی پر رضا مند ہوگئی۔ ان کی شادی ہوگئی۔رات کے وقت لڑکی کا شوہر اسے اپنی گھوڑا گاڑی میں بٹھا کر اپنے گاؤں لے جا رہا تھا۔جب وہ جنگل میں داخل ہوا تو وہاں اس کا رقیب پہلے سے اس کے انتظار میں تھا۔اس نے گھوڑا گاڑی پر بندوق سے فائر کئے ایک گولی لڑکی کو لگی اور وہ ہلاک ہوگئی''

اس حادثے کے دو تین سال بعد لوگوں نے ایک رات جنگل میں پھر ویسا

ہی شور وغل اور فائر کی آوازیں سنیں۔ سب لوگ وہاں گئے لیکن جنگل خالی تھا...... اس وقت سے لے کر اب تک مختلف وقفوں کے بعد ویسی ہی آوازیں جنگل سے سنائی دیتی ہیں۔ جو حادثے کی رات لوگوں کو سنائی دی تھیں...... اور کوئی نہیں جانتا کہ اس میں کیا راز ہے؟

روحوں سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔

۱۹۲۱ء میں ہم ہندوستان سے رخصت ہو کر انگلستان آ گئے...... یہاں کئی سال ہمارا قیام ورتھنگ میں رہا...... ہمارا مکان گنجان آبادی سے ذرا الگ تھلگ ایک پرسکون ماحول میں واقع تھا۔ ابتداء میں ایک سال تک کوئی غیر معمولی روحانی واقعہ پیش نہ آیا۔ لیکن دوسرے سال کے وسط میں ایک روز دوپہر کے وقت ہماری باورچن چلاتی ہوئی باورچی خانے سے نکلی...... دہشت سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ہم سب نے مل کر اسے دلاسا دیا تو پھر اس نے بتایا۔

"میں باورچی خانے میں بیٹھی تھی۔ دفعتہً میں نے ایک آدمی کا سایہ دیکھا جو میری طرف بڑھ رہا تھا...... میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سایہ ساتھ والے مکان کی دیوار میں سے گزر کر دوسری طرف چلا گیا۔

ہم نے اس کا مذاق اڑایا کہ تمہیں دھوکہ ہوا ہے اور اسے اطمینان دلایا کہ سایہ وایہ کچھ نہیں۔ محض فریب نظر ہے۔ مگر چند روز بعد جو واقعات پے در پے پیش آئے۔ انہوں نے ہمارے کان کھڑے کر دئے۔ ہال کمرے کے ایک گوشے میں ایک نہایت پرانی کرسی رکھی تھی۔ جب ہم اس مکان میں آئے تو اس وقت بھی یہ کرسی موجود تھی۔ مکان کی پرانی شے سمجھ کر اس جگہ سے بے جگہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا تھا۔ باورچن والے واقعہ کے دو روز بعد صبح والد صاحب نے دیکھا کہ وہ کرسی ہال کمرے

کے عین وسط میں رکھی ہے۔ انہوں نے اسے اٹھا کر وہیں رکھ دیا جہاں پہلے رکھی تھی یہ بات خلافِ معمول نہ سمجھی گئی۔ اس لئے کسی نے توجہ نہ کی...... دوسرے روز صبح وہ ہال کمرے میں گئے تو کرسی پھر وسط میں رکھی تھی۔ انہوں نے اسے اٹھایا اور اصل مقام پر رکھ دیا۔ بات پھر آئی گئی ہوگئی...... البتہ انہیں حیرت ضرور تھی کہ کرسی ہال کمرے کے وسط میں کس طرح آ گئی۔ تیسرے روز رات کو والد اور والدہ نے سیڑھیوں اور ہال کمرے میں سے ایسی آوازیں سنیں جیسے کوئی چیز گھسیٹی جا رہی ہے۔ اور صبح وہ کرسی پھر ہال کمری کی وسط میں پڑی تھی۔

کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا معاملہ ہے؟ یہ تو طے تھا کہ ضرور کسی "روح" کی کارستانی ہے۔ لیکن اس کرسی اور روح کا آپس میں کیا تعلق تھا؟ یہ بھید نہ کھلتا تھا۔

ایک روز والد صاحب مقامی لائبریری میں گئے اور انہوں نے محض اپنے تجسس کی خاطر ایسی کتاب نکلوائی جس میں اس علاقے کے متعلق پرانی باتیں درج تھیں......

اس کتاب کے مطالعے سے ایک دلچسپ انکشاف ہوا، وہ یہ کہ جس مقام پر ہمارا مکان تھا وہاں سو سال پہلے ایک کھلا میدان تھا۔ جس کے درمیان میں سے پیدل چلنے والوں کے لئے راستہ گزرتا تھا۔ ایک شام عین اس مقام پر جہاں ہمارا ہال کمرہ واقع تھا قتل کی ایک واردات وقوع پذیر ہوئی۔ مقتول کرسیوں کی مرمت کیا کرتا تھا اور واردات کے وقت وہ ایک مرمت شدہ کرسی لے کر اُدھر سے گزر رہا تھا کہ کسی دشمن نے اسے قتل کر دیا...... ہال کمرے میں رکھی ہوئی کرسی وہی تھی، جسے مقتول اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو حکومتِ برطانیہ نے مجھے ملایا بھیج دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہاں کے باشندے جن میں چینی، ہندوستانی، یوریشین اور دوسری کئی نسلوں کے لوگ بھی شامل تھے، بھوت پریت اور بدروحوں پر بڑا یقین رکھتے تھے۔

ملایا کی سرزمین یوں بھی بڑی پر اسرار سی دکھائی دیتی ہے۔ اور مقامی باشندوں کے عجیب اور دل چسپ رسم و رواج ہی ایک اچھے خاصے آدمی کو پاگل بنا دینے کے لئے کافی ہیں۔ ملایا میں قیام کے دوران میں ایک مرتبہ مجھے کوالالمپور تعینات کیا گیا۔ اس پہاڑی پر چند چھوٹے لیکن پرانے مکانات بنے ہوئے ہیں جنگ کے دوران میں دشمن نے ان پر قبضہ کرلیا تھا۔ جب میں وہاں گیا تو ایک مکان میں کسی بڑے پولیس افسر کا قیام تھا۔ انہی دنوں اس کی بیوی کو ایک عجیب و غریب واقعے کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک روز شام کے وقت وہ مکان کے کمرے میں بیٹھی اپنے خاوند کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک اس نے مکان کی طرف آنے والے پہاڑی راستے پر بھاری قدموں کی آواز سنی۔ یہ آواز آہستہ آہستہ نزدیک آتی گئی۔ پہلے پہل عورت نے خیال کیا کہ شاید کوئی کانسٹیبل ضروری پیغام لے کر آرہا ہے۔ اس نے قدموں کی چاپ گھر کے برآمدے میں سنی اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن اس کو کوئی نظر نہ آیا۔ قدموں کی آواز برآمدے میں سے گزرتی ہوئی کھانے کے کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر باورچی خانے میں پہنچی اور رک گئی۔ جیسے کوئی شخص باورچی خانے میں پہنچ کر رک گیا ہو۔ چند لمحوں تک تو عورت دم بخود اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ آخر جرات کر کے اٹھی اور باورچی خانے کی طرف گئی تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔

لوگوں نے اس کی توجیہہ یوں کی کہ جنگ کی دوران میں یہاں ایک فوجی افسر رہتا تھا۔ بعد ازاں وہ مارا گیا۔ اب اس کی روح عین اس وقت گھر پر آئی، جس وقت فوجی افسر اپنی زندگی میں گھر واپس آیا کرتا تھا۔

یہ تو تھے انسانی روحوں کے متعلق چند مشاہدات...... اب جانوروں کی روحوں کے بارے میں بھی کچھ واقعات سن لیجئے۔ جن کا میں نے بذاتِ خود مشاہدہ

کیا...... اور جن میں ذرہ بھر بھی مبالغہ نہیں۔ میرا قیام جس قصبے میں تھا۔ اس کے ایک طرف ایک وسیع و عریض دلدلی میدان تھا اور دوسری طرف گھنے جنگل میں سے ریل کی پٹڑی گزرتی تھی مجھے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ جنگلی ہاتھیوں کے غول ریلوے لائن کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ریل آ گئی...... ہاتھیوں کے سردار کو طیش آیا اور اس نے انجن کو ٹکر ماری۔ ہاتھی تو وہیں مر گیا، لیکن انجن کی شکل ایسی بگڑی کہ وہ مرمت کے قابل ہی نہ رہا۔ لوگوں نے قسمیں کھا کھا کر مجھے یقین دلایا کہ اب بھی اسی وقت وہاں ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آوازیں آیا کرتی ہیں۔ حالانکہ وہاں کوئی ہاتھی نہیں ہوتا۔

ایک مرتبہ میں نے اردگرد کے گاؤں دیکھنے کا پروگرام بنایا میرے ساتھ دو مقامی مسلمان راہبر اور چند دوسرے دوست تھے جو محض تفریح کے لئے میرے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ دوپہر کے وقت کمپونگ گاجاہ" پہنچے۔ جس کے معنی ہیں "ہاتھیوں کا گاؤں" یہاں میں نے عجیب عجیب کہانیاں سنیں۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے ہمیں گھنا جنگل عبور کرنا پڑا۔ یہاں زمین دلدلی تھی۔ میرے دونوں مسلمان راہبر جو نہایت باتونی آدمی ثابت ہوئے تھے۔ پراسرار طور پر چپ تھے۔ اچانک ہم ایک ایسے دلدلی مقام پر آئے جس میں سے بڑے بڑے بلبلے اٹھ رہے تھے اور دلدل میں سے ایسی سنسناہٹ پیدا ہو رہی تھی، جیسے وہ اندر ہی اندر کھول رہی ہو۔ میں نے دیکھا۔ اس کی سطح پر بدبودار تیل بھی تیر رہا تھا۔

جناب، اس مقام پر کئی ہاتھی دلدل میں غرق ہو گئے تھے...... مسلمان راہبر نے کہا کس طرح؟ میں نے تعجب سے پوچھا۔

وہ دلدل میں لوٹنے کے لئے آئے تھے۔ لیکن جونہی انہوں نے اس میں قدم رکھا۔ دوبارہ باہر نہ نکل سکے۔ اس کی عین درمیان میں جو بڑا سا سوراخ آپ

دیکھ رہے ہیں۔ وہ دریا سے تعلق رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں دلدل ہر وقت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور بے حد گہری ہے۔ وہ دیکھئے جناب...... ہاتھیوں کی ہڈیاں اوپر اٹھ رہی ہیں۔

میں نے اس طرف دیکھا...... واقعی چند بڑی بڑی ہڈیاں دلدل کے ساتھ ابھریں اور پھر نیچے بیٹھ گئیں۔ دوسرے راہبر نے جس کا نام حسین تھا، مجھ سے کہا۔

اور جناب ان ہاتھیوں کی روحیں اب بھی گاؤں والوں کو دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بالکل سچ ہے جناب۔ وہ ہمیشہ تعداد میں تین ہوتے ہیں اور شام کے وقت چیختے چلاتے اسی دلدل میں دکھائی دیتے ہیں۔ آپ چاہیں تو خود بھی انہیں دیکھ سکتے ہیں۔

یہ تم کس دعوے کی بنیاد پر کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے وہ ''اصلی ہاتھی'' ہی ہوں۔ اس علاقے میں ہاتھی کثرت سے ہیں..........''

''نہیں جناب وہ اصلی ہاتھی ہرگز نہیں...... ایک شخص حامد نے ان پر فائر کیا تھا۔ گولی ہاتھی کو پار کرتی ہوئی درخت کے ایک تنے میں پیوست ہو گئی تھی''۔

اس بات پر یقین کرنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ میں اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔ سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر پہلے ہمارا چھوٹا سا قافلہ کمپونگ گاجاہ'' کی حدود میں داخل ہو گیا میں نے سب سے پہلے کھانا کھایا اور دن بھر کی سخت تھکاوٹ کے باعث مچھر دانی لگا کر سو گیا۔ شاید مجھے سوئے ہوئے ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہی ہوا ہوگا۔ کہ کسی نے میرا کندھا دبا کر مجھے جگا دیا۔ میں نے اٹھتے ہی جھپٹ کر اپنی رائفل اٹھالی۔

''اٹھیے...... جناب...... فوراً اٹھ جایئے۔

میں نے اپنے ایک راہبر کی تھرائی ہوئی آواز پہچان لی۔

میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں اپنے بستر سے اٹھا، جلدی

جلدی کپڑے پہنے اور راہبر کے ساتھ مکان کے بیرونی برآمدے میں گیا۔عین اس لمحے جنگل کی جانب سے ہاتھیوں کے چنگھاڑنے کی آوازیں مجھے سنائی دیں۔ان آوازوں سے یوں محسوس ہوتا تھا،جیسے ہاتھی کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔

وہ دیکھئے...... راہبر نے جنگل کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔آسمان پر چاند روشن تھا اور اس کی کرنیں پتوں سے چھن چھن کر جنگل میں مدھم سی روشنی پھیلا رہی تھیں۔دور...... دریا کا پانی ایک چمکدار لکیر کی مانند بل کھاتا ہوا بہہ رہا تھا۔پہلے پہل میں کچھ نہ دیکھ سکا۔مگر فوراً ہی گھنے درختوں کے درمیان میں نے تین ہاتھیوں کو دیکھا۔وہ کبھی دکھائی دیتے اور کبھی نظروں سے اوجھل ہو جاتے...... چند لمحے بعد بادل کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے نے چاند کو ڈھانپ لیا اور جب چاند نے اس کی اوٹ سے سر نکالا تو ہاتھی غائب تھے۔

علی الصبح جب میں بیدار ہوا تو رات کا واقعہ ایک خواب کی مانند مجھے یاد آ گیا۔میں نے گاؤں کے لوگوں سے اس بارے میں کئی باتیں پوچھیں اور ان سے کہا کہ جن ہاتھیوں کو وہ بھوت سمجھ رہے ہیں۔وہ ان کا وہم ہے۔مدھم سی چاندنی میں درختوں کی بڑی بڑی شاخوں کے سائے اس طرح نمایاں ہوتے ہیں کہ وہ دور سے ہاتھی کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور جب ہوا درختوں کی شاخوں میں سے گزرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔جسے وہ غلطی سے ہاتھیوں کی آواز سمجھتے ہیں۔

"جناب ! آپ کو اس طرح یقین نہیں آئے گا۔آیئے میرے ساتھ......

وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر اسی طرف گیا۔جہاں میں نے گزشتہ رات ہاتھیوں کو دیکھا تھا۔خاموشی سے ہم دونوں وہاں گئے.......... اور پھر اس نے انگلی سے دلدل کی طرف اشارہ کیا...... اور میں نے دیکھا کہ وہاں ہاتھیوں کے تازہ قدموں کے بڑے بڑے نشانات نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

ایک زندہ......ایک مُردہ

(مقبول جہانگیر)

مجھے وہ بھیانک سماں اب بھی اچھی طرح یاد ہے کہ کس افراتفری کے عالم میں وہاں سے بھاگنا پڑا تھا۔خدا دشمن پر بھی ایسا وقت نہ لائے۔موت کا فرشتہ ہماری دائیں بائیں اور آگے پیچھے، ہر لمحے ہمیں دبوچ لینے کے لئے حرکت کر رہا تھا۔ہم گھنی خار دار جھاڑیوں میں سے راستہ بنا کر گزر رہے تھے اور سروں پر سے گولیاں شائیں شائیں کرتی ہوئی نکل رہی تھیں۔فائرنگ اتنی تیز تھی کہ ہمارے لئے یہ جاننا دشوار ہوگیا کہ گولیاں کس طرف سے برس رہی ہیں۔ ہمارے سامنے درختوں کا ایک بڑا جھنڈ تھا۔کوئی ڈیڑھ سو فٹ دور، اسی جھنڈ میں سے سرخ سرخ، مچلتے ہوئے ہمارے جسم لہولہان ہو چکے تھے۔اور اتنی مہلت بھی نہ تھی کہ ہم اپنے بازوؤں اور پشت پر چھپے ہوئے کانٹ بھی نکال سکتے۔

دفعتہً میرا ایک ساتھی دبی دبی چیخ مار کر زمین پر گرا۔اس کے منہ سے خون جاری تھا۔اس سے پیشتر کہ ہم اس کی کوئی مدد کرتے، وہ دوسری دنیا کو جا چکا تھا۔اس کی بے نور ادھ کھلی آنکھوں میں خون کی بجائے حیرت تھی......ہم نے اس کی لاش یونہی پڑی رہنے دی اور آگے بڑھ گئے۔

یکا یک میں نے درختوں کی اس عظیم جھنڈ میں اسے دیکھ لیا......وہ ایک لمبا تڑنگا ترک تھا......اور گھنی جھاڑیوں میں چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔شدید زخمی ہونے کے باوجود میں اپنا جوش دبا نہ سکا اور اس کی طرف لپکا۔اچانک ایک گولی میرا دایاں کان زخمی کرتی ہوئی نکل گئی۔اس نے مجھ پر فائر کیا تھا۔لیکن میں کوئی پرواہ کئے بغیر اس کی طرف بڑھتا تھا۔اب میں نے دیکھ لیا تھا کہ وہ اپنی جان بچانے کے لئے

دیوانہ وار ادھر سے ادھر بھاگ رہا ہے۔ مگر جھاڑیاں اسے کہیں نکلنے کا راستہ نہیں دیتیں۔ میں اس کے نہایت قریب پہنچ گیا۔ وہ بری طرح چیخ رہا تھا۔ شاید موت کے خوف نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔ اسے اتنا ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ جھاڑیوں کو آسانی سے پھلانگ کر دوسری طرف جا سکتا۔

****

میں نے ایک ہی حملے میں اسے نیچے گرا دیا اور اس کی رائفل چھین کر پرے پھینک دی پھر میری چمکتی ہوئی سنگین اس کے سینے میں پوری اتر گئی۔ ترک سپاہی کے حلق سی ایک لرزہ خیز آواز نکلی اور وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ فائرنگ اور تیز ہو گئی۔ میں اندھا دُھند آگے بھاگ رہا ہوں۔ ایک کھلی جگہ پہنچ کر میں نے بھی فائر کئے ہیں۔ اچانک نعروں کی آوازیں فضا میں پھیلتی ہیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔ اب میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ہے۔ کچھ سجھائی نہیں دیتا...... میں ایک جگہ رُک کر اپنی آنکھیں زور زور سے ملتا ہوں۔ نظروں کے سامنے پتنگے سے اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ اوپر دیکھتا ہوں تو نیلا نیلا آسمان اور اس پر بادلوں کے سفید سفید آوارہ ٹکڑے

وقت چیونٹی کی رفتار سے گزر رہا ہے۔ دفعتہً میرے سر پر سے چند حسین چڑیاں چہچہاتی ہوئی نکل جاتی ہیں...... پھر شہد کی ایک مکھی بھنبھناتی ہوئی میرے نزدیک آتی ہے چند لمحے تک میرے گرد چکر کاٹنے کے بعد شہد کی مکھی کسی اور طرف چلی جاتی ہے۔ میں بڑی مشکل سے اپنے دائیں بازو کو حرکت دیتا ہوں اور اسے زمین پر ٹکا کر اٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ عین اسی لمحے ایک برقی روسی میرے جسم میں دوڑتی ہے...... میں پھر گر پڑتا ہوں...... سر گھوم رہا ہے۔ آنکھوں کے آگے پھر وہی اندھیرا...... گھپ اندھیرا......

جب میں دوبارہ ہوش میں آتا ہوں تو ایک نیا منظر سامنے ہے۔آسمان ستاروں سے روشن ہے...... ہزاروں ستارے ہیں جو چمک چمک کر مجھے حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔میرا ذہن اس وقت بھی ماؤف ہے۔کچھ یاد نہیں آتا کہ میں یہاں کیوں پڑا ہوں...... میرا خیمہ کہاں ہے...... میرے ساتھی کدھر ہیں...... میں انہیں پکارنے کی کوشش کرتا ہوں...... مگر حلق سے آواز نہیں نکلتی...... میں حرکت کرنا چاہتا ہوں لیکن جسم کے ایک ایک رگ پٹھے سے ناقابلِ برداشت درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں...... میں بری طرح ہانپنے لگتا ہوں...... پھر آہستہ آہستہ میری یادداشت واپس آنے لگتی ہے۔

آہ...... میں جنگ کرتے ہوئے زخمی ہوگیا ہوں۔میں نے ایک ترک سپاہی کو موت کے گھاٹ اتارا ہے...... جھاڑیوں میں رینگ رینگ کر میرا جسم خون میں لت پت ہے...... وردی تار تار ہو چکی ہے اور میری رائفل...... نہ جانے کہاں ہے...... میں اپنی ٹانگوں کو ہاتھ لگاتا ہوں...... اُف...... دونوں ٹانگوں پر خون کے لوتھڑے سے جمے ہوئے ہیں اور شاید ان زخموں پر چیونٹیاں سی رینگ رہی ہیں...... میرا جسم تھر تھر کانپنے لگتا ہے...... کانوں میں سائیں سائیں کی تیز آواز آرہی ہے یوں محسوس ہو رہا ہے۔جیسے میرا جسم ابھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر جائے گا۔

حافظے کی چند گرہیں اور کھلتی ہیں۔یاد آتا ہے کہ میں پہاڑ کی چوٹی ہی پر زخمی ہو کر گر پڑا تھا ہماری بٹالین کمانڈر نے مسرت سے چیختے ہوئے کہا تھا۔

"بہادر سپاہیو! ہم وہاں ضرور پہنچیں گے...... ہمیں کوئی نہیں روک سکتا"

کمانڈر کا کہنا صحیح نکلا۔ہم زبردست جانی قربانی دے کر وہاں پہنچ گئے تھے...... ہم نے دشمن سے وہ چوکی چھین لی تھی۔ہمیں شکست ہرگز نہیں ہوئی...... پھر...... یہ سب کیا ہے...... میرے ساتھی میری خبر کیوں نہیں لیتے۔کیا وہ سب کے

سب مارے تو نہیں گئے؟

رات سخت سرد ہے..... مشرق کی جانب سے چاند آہستہ آہستہ آسمان پر اٹھ رہا ہے۔ اس کی سوگوار زرد روشنی میرے اردگرد پھیل گئی ہے اور منظر زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ میرے جسم میں اب کچھ کچھ راحت آ رہی ہے..... میں ہمت کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔ لیکن درد کی شدت اتنی ہے کہ میں اپنی چیخیں روک نہیں سکتا۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی ہیں۔ میرے چاروں طرف لمبی لمبی کالی جھاڑیاں سر اٹھائے کھڑی ہیں بھوتوں کی مانند..... دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں۔ مین ان جھاڑیوں کے قریب کیسے پہنچ گیا۔ ممکن ہے مجھے یہاں کوئی اور شخص اٹھا لایا ہو۔ اتنا یاد ہے کہ میں میدان جنگ میں زخمی ہوا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میں خود گھسٹتا ہوا یہاں تک آ گیا ہوں، لیکن اب..... اب تو میں جنبش کرتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں۔ یقیناً میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہے۔

میں چپ چاپ پیٹھ کے بل پڑا آسمان پر چمکتے ہوئے ان گنت ستاروں کو دیکھ رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ ان کی چمک ماند پڑ رہی ہے۔ منظر دھندلانے لگا ہے۔ میں اب چاند کی طرف نظریں جما دیتا ہوں..... اف..... اگر میں اپنے گھر میں آرام کرسی پر لیٹ کر چاند کو دیکھتا تو یہ کتنا پیارا نظر آتا۔

دفعتہً میرے کانوں میں کچھ غیر مانوس سی آوازیں آتی ہیں۔ میں اپنے کان ان آوازوں پر لگا دیتا ہوں..... ہاں..... اب معلوم ہوا..... کوئی اور شخص قریب ہی پڑا ہوا درد سے کراہ رہا ہے۔ وہ بھی میری طرح زخمی ہے۔ شاید اس کی ٹانگوں پر بھی خون کے لوتھڑے جمع ہوں یا شاید اس کے پیٹ میں گولیاں لگی ہوں۔ وہ مسلسل چلا رہا ہے۔ جیسے جان کنی کے عالم میں ہو۔ اس کی ہر آواز پر میرا کلیجہ بیٹھنے لگتا ہے..... میں خوب غور سے اپنے اردگرد دیکھتا ہوں۔ مگر یہاں تو میرے سوا اور کوئی

نہیں ہے۔ آہ...... کیا یہ میری اپنی آواز تو نہیں؟ مگر مجھے اس وقت کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی...... البتہ سر چکرا رہا ہے۔ اب کیا کروں......؟ ہمیشہ کی نیند سو جاؤں۔ ہاں یہی بہتر ہے۔

میں اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں اور ٹانگیں پھیلا کر سکون سے مرنا چاہتا ہوں۔ یکا یک مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک بڑی کالی سی شے نظر آتی ہے۔ اس کے اوپر چند چمک دار چیزیں دھری ہیں۔ غالباً یہ چمک دار چیزیں وردی کے بٹن ہیں پھر میں غور سے اس بڑی کالی شے کو گھورتا ہوں۔ یقیناً میری طرح کوئی آدمی زخمی ہے یا مُردہ...... اور میں اس بھیانک کیفیت میں ڈوب جاتا ہوں کہ دوسرا شخص کون ہے۔ دوست یا دشمن مجھے سونا نہیں چاہیے ممکن ہے وہ دشمن ہو اور بے ہوش پڑا ہو جب وہ ہوش میں آئے تو مجھے مار ڈالے نہیں ہرگز نہیں۔ میں دشمن کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آتا ہے۔ شاید میں حد درجہ بڑھی ہوئی نقاہت کے باعث ان کی آوازیں نہیں سن سکتا۔ وہ سب یہیں ہوں گے۔

مدد............ مدد............

میرے حلق سے بھرائی ہوئی چیخیں برآمد ہوتی ہیں اور فضا کے بے کراں سناٹے میں گم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ میری مدد کو کوئی نہ آئے ا۔ ہاں جھینگروں نے یکا یک بولنا شروع کر دیا ہے۔ دھندلا دھندلا چاند اب بالکل میرے سر پر آ گیا ہی اور محبت کی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا ہے۔

میں پھر اپنے قریب پڑے ہوئے اس شخص کو دیکھتا ہوں جو نہ جانے کون ہے۔ یہ ضرور کوئی لاش ہے۔ اگر یہ زخمی ہوتا تو میرے چیخنے چلانے سے ضرور ہوش میں آ جاتا۔ مجھے اس احساس سے ایک عجیب سکون مل رہا ہے۔ میری آنکھیں آپ ہی آپ بند ہوئی جاتی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ کل ہی تو میں زخمی ہوا ہوں۔ ایک

دن اور ایک رات۔ پھر ایک دن اور ایک رات اور گزرے گی۔ اس کے بعد...... شاید میں مر جاؤں گا۔ مگر مجھے ایسی بے ہودہ باتیں نہیں سوچنا چاہیں۔ پھر اخباروں میں کچھ ایسی خبریں چھپیں گی۔ ہمارا نقصان زیادہ نہیں ہوا چند سپاہی بہادری سے لڑتے ہوئے زخمی ہوئے اور ایک سپاہی جو دراصل رضا کار تھا، ہلاک ہو گیا، اس بہادر رضا کار کا نام آئی وانا ف تھا۔ میں خود ہی ہنس پڑتا ہوں۔ کیا وہ میرا نام بھی اخباروں میں چھپوا دیں گے؟ شاید اتنا ہی لکھ دیں کہ ایک رضا کار مارا گیا"۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی معمولی کتا مر جاتا ہے۔

اب میں سب کچھ آسانی سے سمجھ رہا ہوں۔ پچھلی باتیں یاد آ رہی ہیں میں اس وقت اپنے شہر کے ایک محلے سے گزر رہا تھا کہ لوگوں کا ایک بڑا ہجوم نظر آیا۔ میں بھی اس ہجوم میں گھس جاتا ہوں، لوگوں کے درمیان ایک چھوٹے سے کتے کی لاش پڑی ہے۔ بے چارہ کتا...... ایک تیز رفتار ٹرام کے نیچے آ کر بری طرح کچلا گیا ہے۔ اس کا جسم قیمہ بن گیا ہے۔ سب لوگ افسوس کی نظروں سے کتے کو دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں ایک شخص آگے بڑھ کر کتے کی گردن پکڑ لیتا ہے اور نہ جانے کہاں لے جاتا ہے پھر لوگ ایک ایک کر کے منتشر ہو جاتے ہیں۔

میری حالت بھی اس کتے کی سی ہے، لیکن کیا مجھے بھی کوئی آدمی اٹھا کر لے جائے گا؟ نہیں...... میری قسمت میں یہی لکھا ہے کہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤں۔

ستارے غائب ہو رہے ہیں۔ چاند بھی مغرب میں جھک کر اوجھل ہو گیا ہے، مشرق کی جانب آسمان پر ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چمکتا دمکتا سورج نکل آئے گا۔ سورج، جو زمین کو زندگی اور مسرت کا انمول خزانہ بخشتا ہے۔ اف...... مسرت کے گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں کتنی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ کاش۔ میں یہ سب باتیں بھول سکتا۔

میں وہیں پڑا ہوں۔ سورج آسمان سے آگ برسا رہا ہے۔ میرا جسم تپ کر گرم ہو گیا ہے۔ میرے اردگرد وہیں بھیانک جھاڑیاں اور گھاس پھوس کے ڈھیر ہیں۔ اب میں اس شخص کو پہچان لیتا ہوں۔ جس کی لاش مجھ سے چند قدم کی فاصلے پر پڑی ہے۔ خدا رحم کرے۔ یہ تو وہی ترک سپاہی ہے جسے میں نے سنگین مار کر ہلاک کیا تھا۔ کتنا قوی ہیکل اور لمبا تڑنگا جوان ہے، میں نے اسے قتل کیا ہے۔

یہ بدنصیب جوان بھلا یہاں کس لئے آیا تھا؟ اور نہ معلوم یہ ہے کون؟ کس ماں کا لال ہے؟ شاید میری ماں کی طرح اس کی بھی کوئی بوڑھی ماں ہو جو شام ہوتے ہی اپنی جھونپڑی کے دروازے پر آن کر بیٹھ جاتی ہو اور اپنے بیٹے کی راہ تکتی ہو۔ اپنے پیارے، جان سے زیادہ عزیز بیٹے کی راہ...... جو ماں کی آرزو اور امیدوں کا سہارا ہے۔ کاش میں اس ترک سپائی کے ہاتھوں مارا جاتا...... وہ کتنا خوش نصیب ہے...... دنیا و مافیہا سے بے خبر اس کے زخم بھی اب اسے تکلیف نہیں دے رہے ہیں اور نہ وہ میری طرح اس ذہنی عذاب میں مبتلا ہے۔ اسے بھوک ستاتی ہے نہ پیاس...... آہنی سنگین اس کے دل میں یوں اتر گئی ہے جیسے کسی نرم تربوز میں لمبا چاقو اترا ہو۔ اس کی وردی میں ایک بڑا سا سوراخ ہے...... یہ سوراخ کس نے کیا؟ میں نے...... میں نے۔

میں بے اختیار رو پڑتا ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوا ہے جیسے میں نے اپنے سگے بھائی کو قتل کر دیا ہے...... لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا...... مجھے تو جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں زبردستی دھکیل دیا گیا تھا۔ مجھے تو کسی سے عداوت نہ تھی...... کوئی میرا دشمن نہ تھا............

جب میں وردی پہن کر اور ہتھیار سنبھال کر میدانِ جنگ میں ایا تو میں نے سوچا تھا کہ بہادری کی موت مروں گا۔ گولیوں کی بارش میں سینہ تان کر کھڑا ہو جاؤں

گا۔کوئی زخم میری پیٹھ پر نہیں لگے گا۔ چنانچہ میں آیا اور میں نے اپنا سینہ گولیوں کے سامنے تان دیا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اور یہ بیچارہ ترک سپاہی...... یہ بھی میری طرح بالکل بے قصور ہے۔ بھلا اس کی اور میری کیا دشمنی تھی...... اسے تو میرا نام بھی معلوم نہ تھا۔ بے چارے نے شدید قسطنطنیہ پہنچنے سے پہلے روز یا بلغاریہ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ سنا ہوگا۔ اسے حکم دیا گیا ہوگا اور اس نے گردن جھکا دی۔ اگر وہ جنگ میں حصہ لینے سے انکار کرتا، تب بھی زندہ نہ بچتا، شاید اس کی فوج کا کوئی افسر اس کی کھوپڑی میں سیسے کی گولی اتار دیتا۔ وہ ایک لمبے سر کے بعد...... تھکا ماندہ جارحانہ انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ اس لئے وہ گھبرا گیا...... اس نے بھاگنے کی بجائے مردانہ وار موت کا مقابلہ کیا۔ شاید وہ مجھے مار دیتا۔ یہ بات اس کے لئے بہت آسان تھی۔ میں تو اس کے ایک گھونسے کی ضرب بھی برداشت نہ کرسکتا تھا۔ نہ جانے میری سنگین اس کے سینے میں کیونکر اتر گئی۔ اگرچہ میں نے اسے قتل کیا ہے، لیکن میرا اس میں کچھ زیادہ قصور نہیں ہے۔

سوچتے سوچتے میں پاگل ہوا جا رہا ہوں، حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں...... پیاس...... شدید پیاس...... آج معلوم ہوا کہ پیاس کسے کہتے ہیں۔ کاش! کوئی ادھر آنکلے اور مجھے ایک گھونٹ پانی پلا دے۔

ارے! ترک کی لاش کی قریب پانی کی چھاگل پڑی ہے۔ اس میں ضرور پانی ہوگا میں یہ چھاگل اٹھالوں گا...... مگر یہ چند قدم کا فاصلہ کیونکر طے ہوگا...... میں تو ایک انچ بھی سرک نہیں سکتا۔ خیر، کچھ بھی ہو...... مجھے یہ چھاگل حاصل کرنی ہوگی۔ ہر قیمت پر......

میں رینگ رہا ہوں...... لیکن میرے کمزور بازو اور زخمی ٹانگیں حرکت نہیں مجھے کچھ اور یاد آتا ہے۔ کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ انسان غذا کے بغیر ایک

ہفتے سے زیادہ زندہ رہ سکتا ہے بشرطیکہ اس کے پاس پانی موجود ہو مگر...... اس سے فائدہ؟ مرنا تو ہر صورت میں ہے۔ میرے ساتھی یہاں سے جا چکے ہیں۔ غالباً کوئی سڑک بھی قریب نہیں ہے، کسی کو پتہ نہیں کہ یہاں ایک زندہ اور ایک مردہ پڑا ہے۔ اب یہ ہوگا کہ مجھے مزید کچھ دن کے لئے جان کنی کی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ میں ابھی اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں۔ ترک سپاہی کی رائفل میرے پاس پڑی ہے۔ مجھے صرف ایک انگلی ہلانی پڑے گی۔

رائفل کو ہاتھ لگاتے ہی میری انگلیوں میں برقی لہر سی دوڑ جاتی ہے یا نہیں۔...... ہرگز نہیں...... میں ہمت نہیں ہاروں گا...... آخر وقت تک بچنے کی کوشش کروں گا۔ یقیناً مجھے بچالیا جائے گا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ میری ہڈیوں پر ضرب نہ آئی ہو اور میں چند روز ہسپتال میں آرام کر کے چلا جاؤں، پھر میں اپنا وطن، اپنی پیاری ماں اور حسین بیوی کو دوبارہ دیکھ سکوں گا...... ان کا خیال آتے ہی میرے اندر جوش اور ولولے کی ایک نئی لہر جنم لیتی ہے۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں......

میرا سر گھوم رہا ہے...... اس کی وجہ شاید وہ بدبو ہے جو ترک سپاہی کی لاش سے مسلسل اٹھ رہی ہے۔ اس کا جسم کالا پڑ گیا ہے۔ کل اس کی سڑاند اور بڑھ جائے گی...... اور؟ میں یہاں صرف اس لئے پڑا ہوں کہ مجھ میں اپنے جسم کو گھسیٹنے کی طاقت نہیں ہے۔

میرے زخموں میں سے پھر کون رسنے لگا ہے اور ٹیسیں اٹھ رہی ہیں...... مگر مجھ میں اب کراہنے کی قوت بھی باقی نہیں۔ دھوپ میرے چہرے کو بری طرح جھلس رہی ہے۔ کہیں پناہ لینے کی جگہ نہیں...... سورج نہ جانے کب غروب ہوگا...... میں پھر بے ہوش ہو رہا ہوں۔

ایک بار پھر میری آنکھ کھلتی ہے کچھ سکون محسوس کرتا ہوں۔ آسمان پر شوخ

تارے چمک رہی ہیں اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ میں چھاگل میں سے ایک گھونٹ پانی پی کر اپنا حلق تر کرتا ہوں۔ ترک کی لاش میں سے بدبو برابر اٹھ رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں، کیا میں سردی میں ٹھٹھرتا اور گرمی میں جھلستا ہوا یہاں صرف اسی لئے آیا تھا کہ اس بدنصیب ترک کو زندگی کی مسرتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم کردوں؟ اسے قتل کردوں...... میں قاتل ہوں...... مجھے سزا ملنی چاہیے۔

میں نے جب میدانِ جنگ میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تو میری بیوی اور میری ماں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ان کے چہرے زرد پڑ گئے تھے اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ پھر ان کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ کر زمین پر بکھرنے لگے۔ انہوں نے ایک لفظ بھی تو نہ کہا۔ کاش! وہ مجھے روک لیتیں...... محاذ پر نہ جانے دیتیں...... اس وقت مجھے بالکل احساس نہ تھا کہ میرے اس ارادے سے ان بے گناہ عورتوں پر کیا گزر جائے گی۔ وہاں اب یہ احساس بخوبی کرسکتا ہوں۔

مین چپکے چپکے آنسو بہا رہا ہوں، ہوا اور تیز ہوگئی ہے۔ جھاڑیاں زور زور سے ہل رہی ہیں اور گھاس کے ریشے جھوم رہے ہیں...... ایک پرندہ اچانک بولنے لگتا ہے...... میرے علاوہ ایک ذی روح اور اس جگہ موجود ہے...... لیکن وہ میرے حال سے بےخبر ہے۔ اتاروں کی روشنی پھر ماند پڑتی جارہی ہے۔ آسمان پر سفید بادلوں کی فوج اُمڈی چلی آرہی ہے۔ شاید بارش ہو...... مگر نہیں...... تھوڑی دیر بعد بادلوں کی یہ فوج کسی اور طرف نکل جاتی ہے۔ اکادکا تارے پھر مجھے گھورنے لگتے ہیں۔ دن کی آمد امد سے میرا کلیجہ کانپ رہا ہے۔ ایک بار پھر مجھے دھوپ میں تپنے کے لئے تیار رہنا چاہیے۔

تیسرا دن بھی شروع ہوگیا...... نہ جانے ایسے کتنی دن اور ہیں میری کمزوری

انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ میں ترک سپاہی کی سڑتی ہوئی لاش سے دور ہٹنا چاہتا ہوں۔ مگر حرکت نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے ایک سڑی ہوئی لاش بننے میں کچھ زیادہ دیر نہ لگے گی۔ میں سورج کی طرف دیکھتا ہوں۔ میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ یقیناً آج گزشتہ دو دنوں سے زیادہ گرمی پڑے گی۔ میرے ترک دوست تمہارا کیا حشر ہو گا۔ تم تو اب بھی نہایت بھیانک نظر آتے ہو۔ تمہارے بال جھڑ چکے ہیں، جلد کا رنگ گہرا سیاہ پڑ گیا ہے، سوجا ہوا چہرہ، کھال جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی...... زخموں میں کیڑے رینگ رہے ہیں...... تمہارے جوتوں کے سوراخوں میں سے گوشت اور کھال کے بڑے بڑے ریشے جھانک رہے ہیں۔ کسی ڈوبے ہوئے جانور کو جب دریا سے نکالا جائے تو اس کی لاش پھول جاتی ہے، یہی حال تمہارا ہے۔ بہر حال تمہارا اس حالت میں میرے قریب رہنا سخت عذاب ہے۔ مجھے ہر صورت میں یہاں سے پرے ہٹ جانا ہو گا۔ خواہ میں ایک گھنٹے میں ایک فٹ کا فاصلہ ہی کیوں نہ طے کروں۔

آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ لیکن میں اس لاش سے دور ہٹنے کی جدوجہد کر رہا ہوں۔ میں نے تمام دن وہاں سے پرے ہو جانے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جسم کے رو میں رو میں سے جان نکل رہی ہے۔ تاہم میں آگے بڑھ رہا ہوں۔ چیختا چلاتا اور کراہتا ہوا مسلسل آگے رینگ رہا ہوں...... آخر دن ڈھلے میں پانچ فٹ کا فاصلہ طے کر کے اس مقام پر پہنچ جاتا ہوں۔ جہاں پہلے پہل بے ہوش ہو کر گرا تھا۔ مگر اب وہاں بھی زیادہ دیر تک پڑے رہنا ممکن نہ رہا۔ ہوا نے رخ بدل لیا ہے اور بدبو کے مارے دماغ پھٹا جاتا ہے۔ خدا رحم کرے...... یہ میں کس گناہ کی سزا بھگت رہا ہوں پھر خود بخود میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہے۔

یک لخت میرے اعصاب جاگ اٹھتے ہیں...... میں کچھ آوازیں سن رہا

ہوں...... گھوڑوں کی دوڑنے اور چند آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں...... میں چند لمحے غور سے سنتا رہتا ہوں میرے دل کی دھڑکن رفتہ رفتہ تیز ہورہی ہے۔ یہ تو میری ساتھیوں کی آوازیں ہیں...... ہاں ہاں...... میں ان آوازوں کو خوب پہچانتا ہوں...... مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہاں کوئی نہ ہو۔ صرف میرا وہم......

آوازیں کچھ اور قریب آجاتی ہیں میں خوشی سے بے قابو ہو کر چیخنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ اگر یہ لوگ ترک سپاہی ہوئے تو کیا میں زندہ بچوں گا؟ وہ ایسے سنگدل تو نہیں ہو سکتے کہ مجھے اس حالت میں دیکھ کر بھی مار ڈالیں...... اونہ...... دیکھا جائے گا...... اس عذاب سے تو ہر صورت میں نجات ملے گی...... زندگی...... یا موت...... کوئی تو آئے گی......

آوازیں تھم گئی ہیں۔ آہ...... اب میں انہیں دیکھ لیتا ہوں۔ وہ سب کے سب روسی سپاہی ہیں...... ان کا آدھا دستہ ہے...... آگے آگے ایک قوی ہیکل سیاہ گھوڑے پر سوار کالی ڈاڑھی والا کوئی افسر ہے...... وہ نہ جانے کدھر جا رہے ہیں......

رک جاؤ...... رک جاؤ...... مدد...... مدد...... مین اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے چلاتا ہوں...... لیکن...... آہ...... گھوڑوں کی ٹاپوں اور سپاہیوں کے قہقہوں کے شور میں میری کمزوری چیخیں گم ہو جاتی ہیں...... مجھ میں دوبارہ چیخنے کی ہمت باقی نہیں رہی۔ میں اپنا سر زمین پر مارتا ہوں اور سسکیاں لے لے کر رونے لگتا ہوں۔ اس حرکت سے پانی کی چھاگل الٹ گئی ہے۔ اس کا ڈھکنا کھل گیا ہے...... اور پانی جو میری زندگی ہے...... زندگی کی آس ہے...... بہہ گیا ہے.......... زمین اسے چوس گئی ہے۔ میں جلدی سے چھاگل کو سیدھا کرتا ہوں...... ابھی ایک آدھ گھونٹ پانی بچ رہا ہے......

میرا پیٹ اب دھونکنی کی مانند حرکت کر رہا ہے، میری آنکھ ادھ کھلی ہے......

جسم میں کوئی جنبش نہیں..... کوئی حرکت نہیں..... ہوا مسلسل رخ بدل رہی ہے۔ کبھی سام کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آتی ہیں اور مجھ سے سرگوشیاں کرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ اور کبھی بدبو سے سانس رکنے لگتا ہے۔ ترک سپاہی کی لاش مزید خوفناک ہوگئی ہے۔ اس کے چہرے کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہو چکا ہے۔ اس کے سفید سفید دانت مجھے صاف دکھائی دے رہے ہیں..... جیسے کوئی بھوت قہقہے لگا رہا ہو۔ میرے بدن پر کپکپی سی طاری ہو رہی ہے۔ یہ ہے جنگ''..... میں بڑبڑاتا ہوں اور یہ ہے اس کا نتیجہ

چوتھا دن شروع ہو چکا ہے اور سورج کی وہی بے رحم دھوپ جھلسا رہی ہے۔ میں پانی کا آخری قطرہ بھی چھاگل میں سے چوس چکا ہوں..... ہر طرف غیر معمولی سناٹا ہے..... شاید اب ادھر سے کوئی نہ گزرے گا..... ہاں موت کا فرشتہ دبے پاؤں آئے گا اور مجھے دبوچ کر لے جائے گا۔

تب مجھی اپنی ماں یاد آتی ہے..... ماں..... جس نے مجھے پالا، پروان چڑھایا، اور جو مجھے دیکھ کر جیتی ہے۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ اس کا بیٹا جنگ کے بھیانک شعلوں میں جل کر راکھ ہوگیا ہے۔ تو اس پر کیا بیتے گی..... وہ اپنے سفید بال نوچے گی اور دیواروں سی سر ٹکرائے گی۔ رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لے گی اور شاید اس دن کو کوسے جس دن اس نے مجھے جنا تھا وہ ان تمام لوگون کو کوسے گی جنہیں جنگ پسند ہے خدا تمہارا نگہبان ہو، میری پیاری اماں..... تم میری اس تکلیف کے بارے میں کچھ نہ جان سکو گی.....

میں سورج کی غضب ناک شعاعوں کے گھیرے میں ہوں..... میرے ہونٹ جل رہے ہیں..... میرے نزدیک ہی ایک متعفن لاش پڑی ہے جس کا گوشت آہستہ آہستہ ہڈیوں سے جدا ہو رہا ہے، ہزاروں، لاکھوں مردہ خور چیونٹیاں اس سے چمٹی ہوئی ہیں..... ان کے لئے یہ لاش بڑی نعمت ہے..... وہ اپنا پیٹ بھر

رہی ہیں..... پھر پھر میری باری آئے گی..... یہی چیونٹیاں مجھے بھی چٹ کریں گی۔

دن گزر گیا ہے..... رات بھی کٹ گئی..... لیکن ہر شے اپنی جگہ پر ہے.....

وہی یکسانیت..... اس سے اگلا دن بھی گزر جاتا ہے..... اب میرے کانوں میں مسلسل یہی آواز گونج رہی ہے۔تم مر جاؤ گے، تم مرنے والے ہو..... تم مر جاؤ گے..... تم مر رہے ہو..... روسی سپاہی دور چلے گئے ہیں..... وہ کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے..... میں گھبرا کر چیخنا چاہتا ہوں عین اسی لمحے جھاڑیوں میں جنبش ہوتی ہے اور پھر ہمارے کارپول یا کوفلیف کی نیلی آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی نظر آتی ہیں، وہ منہ پھیر کر نہ جانے کس سے کہتا ہے۔

''ایک گڑھا ادھر بھی کھود لو..... یہاں دو لاشیں پڑی ہیں۔ایک اپنا آدمی ہے اور دوسرا کوئی ترک.....

میں بڑی مشکل سے کراہتا ہوں..... کارپول دوڑتا ہوا میرے نزدیک آتا ہے۔

''ارے..... یہ تو زندہ ہے..... جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔

چند لمحوں بعد میرے ہونٹ پانی سے تر کرتے ہیں..... اور پھر ہر شے نظروں اوجھل ہو جاتی ہے میں شاید اسٹریچر پر لیٹا ہوا ہوں..... وہ مجھے جھولا جھلاتے ہوئے لئے جا رہے ہیں میں کچھ جاگتا ہوں، کچھ سوتا ہوں۔.......... میرے زخموں میں اب درد کی لہریں نہیں اٹھ رہی ہیں۔

رک جاؤ..... سٹریچر اوپر اٹھاؤ..... بس بس..... میرے ساتھ آؤ..... یہ غالباً ڈاکٹر کی آواز ہے..... وہ لمبا تڑنگا اور نہایت ہمدرد آدمی ہے۔ میں مسلسل اس کا چہرہ دیکھے جا رہا ہوں جس کرب کے آثار ابھر رہے ہیں وہ مجھے جلد سے جلد ٹھیک ٹھیک کر دینے کے لئے بے چین ہے۔

ڈاکٹر، کیا میں مر جاؤں گا؟ میں مدھم آواز میں رک رک کر اس سے پوچھتا ہوں۔

نہیں، پیارے دوست، تم زندہ رہو گے: وہ محبت سے جواب دیتا ہے، تم بڑے خوش نصیب ہو کہ تمہاری ہڈیاں محفوظ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم زبردست

کینن ہال کی روح

(مقبول جہانگیر)

ذکر ہے ۱۹۰۲ء کا..... میں اس زمانے میں کرہ ارض کے تاریک دور سے متعلق ایک تحقیقی کتاب لکھنے کی فکر میں تھا۔ اس سلسلے میں میں نے تمام مواد جمع کر لیا تھا اور اب اس تگ و دو میں تھا کہ شہر کے ہنگاموں سے دور کوئی ایسی جگہ ملے، جہاں سکون سے بیٹھ کر یہ کتاب لکھ سکوں۔ جائیداد کی خرید و فروخت کرنے والی ایک ایجنسی نے جب نیویارک ٹاؤن کے ایک مکان کینن ہال کا پتہ بتایا اور میں یہ عمارت دیکھنے گیا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ ایسی الگ تھلگ اور پرسکون جگہ آسانی سے کہیں اور نہ مل سکے گی۔

کینن ہال تین منزلہ نہایت عالی شان قدیم طرز کی عمارت تھی اور گزشتہ چالیس برس سے بالکل خالی پڑی تھی۔ اس کی چاروں طرف کسی زمانے میں نہایت پرفضا باغ ہوگا جو اب دیکھ بھال نہ ہونے کے باعث بھیانک جنگل میں بدل چکا تھا۔ نچلی منزل کی کھڑکیاں لمبی لمبی گھاس خودرو پودوں اور جھاڑ جھنکار کی کثرت سے نظر نہ آتی تھیں، دیواروں پر سیاہ رنگ کی کائی کی گہری تہہ جمی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں سے پلاستر بھی اکھڑ چکا تھا اور خستہ اینٹیں جھانک رہی تھیں۔ لوہے کے دروازے اور ان پر لگی ہوئی سلاخیں زنگ آلود تھیں۔ جا بجا مکڑیوں نے بڑے بڑے جالے تان دیئے تھے اور حشرات الارض کی بھرمار تھی۔

جب میں نے کینن ہال کی عمارت سستے داموں خرید لی اور اس کی مرمت اور صفائی کا ارادہ کیا تو گاؤں کا کوئی شخص بھی اس کے اندر داخل ہونے کے لئے تیار

نہ تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے یہ عمارت خرید کر سخت غلطی کی ہے کیونکہ یہ آسیب زدہ ہے۔ اندھیری راتوں میں اس کے اندر سے چیخنے چلانے اور رونے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اکثر لوگوں نے قسمیں کھا کر کہا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے ایک بھیانک شکل کے آدمی کو اوپر کی منزل میں چلتے پھرتے دیکھا ہے۔

میں یہ قصے سُن کر ہنس دیتا اور لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا کہ یہ سب واہمے ہیں، بھوت پریت یا آسیب کا کوئی وجود نہیں ہوتا، لیکن میری ان باتوں کا گاؤں والوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر میں نے شہر جا کر بھاری معاوضے پر چند آدمی جمع کیے اور انہیں ساتھ لا کر کینن ہال کی صفائی اور مرمت کرائی۔ اس کام میں دو ماہ لگے۔ اس دوران میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا اور میں نے کسی بدروح کو نہ دیکھا، تاہم یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کینن ہال کو ایک عجیب سوگوار اور اندوہ گیں ماحول نے جکڑ رکھا تھا۔ لمبی غلام گردشوں اور بڑے بڑے کمروں میں ہر وقت اداسی سی چھائی رہتی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس عظیم عمارت میں رہنے والا صرف ایک ہی شخص تھا اور وہ میری ذات تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ گاؤں کے لوگوں کو کسی طرح کینن ہال میں آنے اور کچھ دیر بیٹھنے کی دعوت دوں، مگر ہر شخص نے وہاں آنے سے انکار کیا اور میں جس سے بھی ذکر کرتا، وہ فوراً اپنے سینے پر انگلی سے صلیب کا نشان بناتا اور چلا جاتا۔

انہی دنوں میری ملاقات ڈاکٹر البرٹ مارسن سے ہوئی اور چند دن کے اندر اندر ہمارے تعلقات بے تکلفی کی حدوں کو چھونے لگے۔ ڈاکٹر مارسن کا مکان کینن ہال سے کوئی ایک فرلانگ دور تھا اور اس اعتبار سے وہ میرا سب سے قریبی پڑوسی تھا۔ اس کی عمر اسی بیاسی برس کے لگ بھگ تھی، مگر صحت نہایت اچھی اور مزاج بے حد شگفتہ تھا۔ اس عمر کو پہنچ کر اکثر بڈھے بدمزاج اور چڑچڑے ہو جایا کرتے

ہیں۔لیکن ڈاکٹر ماریسن میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔وہ جب ملتا، خوش اخلاقی سے پیش آتا ایک دو بار اس نے مجھے اپنے مکان پر بھی بلایا اور خاطر تواضع کی۔جب اسے معلوم ہوا کہ میں نے کینن ہال خرید لیا ہے اور میں اس عمارت میں مستقل طور پر رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو اس نے کسی حیرت کا اظہار نہ کیا، بلکہ مجھ سے کہا۔

یہ مکان گذشتہ چالیس برس سے بے آباد اور ویران پڑا ہے۔بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آ گئے۔

''جی ہاں، یہ عمارت مجھے پسند آئی اور میں نے خرید لی۔اس کی صفائی اور مرمت وغیرہ کرانے میں دو ماہ لگے ہیں۔آپ کسی روز تشریف لائیے اور دیکھئے۔

میں نے یہ بات ڈرتے ڈرتے کہی تھی کیونکہ احساس تھا کہ ڈاکٹر ماریسن فوراً آنے سے انکار کر دے گا، لیکن اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ مجھے کینن ہال آنے کی دعوت نہ دیتے، تب بھی میں ضرور آتا، میں خود اس مکان میں خاص دلچسپی رکھتا ہوں۔

یہ سن کر میں حیران ہوا۔میرا خیال تھا کہ اب ڈاکٹر ماریسن بھوتوں کے قصے چھیڑے گا، لیکن وہ سر ہلاتا ہوا اپنی گھوڑا گاڑی کی طرف گیا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں کل شام کینن ہال میں حاضر آ ؤں گا۔

اگلے روز وہ وعدے کے مطابق میرے ہاں آیا۔میں نے اسے نچلی منزل کے بڑے کمرے کی حالت دکھلائی وہ حیرت سے ارد گرد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرے کی حالت دیکھتا رہا۔پھر کہنے لگا۔

''آپ نے تو کمال کر دیا ہے، کینن ہال کی حالت ہی بدل دی۔

یقین کیجئے۔آج میں چالیس سال بعد یہاں آیا ہوں، میرے

دوست ہورک کینن کا انتقال بھی اسی زمانے میں ہوا تھا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ شاید زندگی میں دوبارہ یہاں آنے کا موقع نہ ملے گا اور نہ اس جگہ اب کوئی شخص رہے گا، مگر عجیب اتفاق ہے کہ میرے یہ دونوں نظریے غلط ثابت ہوئے''

''آہ! یہ ایک دردناک داستان ہے، ڈاکٹر ماریسن نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔

یہ داستان میں کتنی ہی مرتبہ گاؤں کے مختلف لوگوں کی زبان سے سن چکا تھا۔ اسکا خلاصہ یہ تھا کہ کینن ہال کے مالک ہورک کینن نے بعض پُر اسرار حالات کے تحت گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی تھی اور اَب اس کی رُوح عمارت میں بھٹکتی پھرتی ہے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر سے کہا

''جس داستان کی طرف آپ اشارہ کرتے ہیں، وہ داستان میں گاؤں کے تقریباً ہر فرد کی زبانی سن چکا ہوں اور اب میری درخواست ہے کہ آپ بھی اس بارے میں جو کچھ جانتے ہیں، مجھے بتا دیں''

ڈاکٹر ماریسن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ چند لمحے تک اس کی نیلی آنکھیں چھت کو گھورتی رہیں، پھر اس نے مدھم لہجے میں کہنا شروع کر دیا۔

''واقعہ یہ ہے کہ اصل حادثے کا علم میرے سوا کسی کو نہیں ہے اور میں نے اب تک اس بارے میں کسی سے ایک لفظ نہیں کہا۔ شاید اس لئے کہ کوئی اس پر یقین نہ کرتا۔ مگر آپ صاحبِ علم و فضل ہیں۔ اس لئے آپ کو بتا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ یوں بھی اس راز کو چالیس سال سے اپنے سینے میں دفن کئے ہوئے ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس راز کو اپنے سینے کی قبر سے نکال کر آپ کے

سامنے رکھ دوں۔ کیونکہ آپ کینن ہال کے مالک بن چکے ہیں"

چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس نے انگلی سے چھت کے ایک روشن دان کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں بدنصیب ہورک کینن نے رسّا باندھا اور اپنے گلے میں پھندا ڈال کر خود کو موت کے حوالے کر دیا۔ جہاں تک ہورک کی روح کا تعلق ہے، میں اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ عمارت میں بھٹکتی پھرتی ہے یا اسے سکون مل گیا ہے۔ تاہم چالیس برس پیشتر جو واقعہ یہاں ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آغاز میں ہورک کینن کے والد نے یہ عظیم عمارت بنوائی تھی۔ جب اس کا والد وفات پا گیا تو ہورک اس کا مالک بن گیا...... ہورک عجیب وغریب ذہنیت کا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت کا الفاظ کی مدد سے نقشہ کھینچنا میرے لئے دشوار ہے۔ کبھی جوش وخروش اور غیظ وغضب کی تصویر نظر آتا اور کبھی بالکل مسکین بکری کی طرح بچپن میں اسے پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ کھیل کود سے بھی کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ اپنے ہم جماعت بچوں کو پیٹنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ کئی بار میں بھی اس کے ہاتھوں زخمی ہوا ہوں جب وہ جوان ہوا تو بہت مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک تھا۔ اب وہ دنیا کی سیاحت کے منصوبے بنانے لگا جو کبھی پایہ تکمیل تک نہ پہنچے۔ اس نے کتنی مرتبہ مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ایک طویل بحری سفر کرنا چاہتا ہے، پھر اس نے کہا، وہ دنیا کی مشہور ومعروف درس گاہوں میں داخل ہو کر علم حاصل کرے گا۔ مگر اس نے اس پر عمل بھی نہ کیا۔ انہی دنوں اس کی شادی ہیلن نام کی ایک حسین لڑکی سے ہو گئی۔ وہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی نہایت خاموش، متین اور سنجیدہ مزاج، اس میں غصہ نام کو نہ تھا۔ ہورک اور ہیلن کی یہ شادی کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ دونوں کی طبعیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ علیحدگی ہو گئی۔ اس

وقت ہورک کی زندگی میں ایک اور انقلاب برپا ہوا۔ اس نے کینن ہال سے باہر نکلنا چھوڑ دیا۔ دن رات اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ یہ حالت دیر تک رہی۔ پھر وہ باہر نکلنے لگا۔ کسی روز موسم اچھا ہوتا تو وہ گھوڑے پر بیٹھ کر گردونواح کی سیر کے لئے چلا جاتا۔ یا جھیل پر جا کر مچھلی کا شکار کھیلتا۔ کبھی کبھی گاؤں میں آ کر لوگوں سے بات چیت بھی کرتا۔ لیکن برف باری کے زمانے میں وہ ہفتوں کیا، مہینوں گھر سے باہر نہ آتا اور اسی کمرے میں، جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں، آتش دان کے پاس آرام کرسی میں دھنسا کوئی کتاب پڑھتا رہتا۔ آتش دان کے بارے میں اس نے نوکروں کو سختی سے حکم دے رکھا تھا کہ اس میں کسی بھی لمحے آگ مدھم پڑنے نہ پائے اور اگر اس معاملے میں ذرا سی بھی غفلت ہو جاتی تو وہ نوکروں پر بری طرح برس پڑتا۔ گالیاں دیتا اور بعض اوقات تو ہاتھ بھی چلا دیتا۔

''شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے اندر بھی آگ بھڑک رہی تھی اور وہ آتش دان میں لپکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر تسکین حاصل کرتا تھا''۔ میں نے کہا۔

''آپ کا خیال صحیح ہے۔ ڈاکٹر مارلیسن نے کہا۔ بہر حال آپ قصہ سنیئے، ہورک کے علاوہ کینن ہال میں ایک اور عجیب شخصیت بھی موجود تھی۔ اس کا نام تھا کیور۔ یہ شخص ہورک کا ذاتی خادم ہونے کے ساتھ ساتھ خانساماں بھی تھا اور مالی بھی۔ اس کے علاوہ دوسرے ملازموں کی نگرانی بھی کیور ہی کے سپرد تھی۔ کیور کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، اپنے بارے میں اس نے کبھی کچھ نہ بتایا۔ گاؤں والے اس کے بارے میں بھی طرح طرح کی باتیں بنایا کرتے تھے، لیکن کیور نے کبھی زبان نہ کھولی، بلاضرورت وہ کسی سے بات نہ کرتا تھا اور غیر متعلقہ سوالوں کو یوں نظر انداز کر دیتا جیسے سنا ہی نہیں۔ پہلے پہل مجھے باورچن کی زبانی معلوم ہوا کہ کیور نام کا ایک شخص کینن ہال میں ملازم رکھا گیا ہے۔

جس کی حرکتیں نہایت پر اسرار ہیں۔ پھر ایک روز میں نے کیور کو دیکھا۔ ان دنوں ہورک کا موڈ کچھ اچھا تھا۔ چنانچہ اس نے گاؤں کی چند سر کردہ افراد کو کینن ہال میں رات کے کھانے پر بلایا تھا۔

کیور ادھیڑ عمر کا ایک دبلا پتلا آدمی تھا، دھنسی ہوئی زرد آنکھیں، مری ہوئی ناک اور پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹ جب وہ چلتا تو اس کے پیروں کی آہٹ سنائی نہ دیتی تھی۔ کھانے کے دوران میں وہ کئی مرتبہ کمرے میں آیا، لیکن اس نے ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہا۔ اگر کوئی مہمان اس سے مخاطب ہو کر کسی چیز کی فرمائش کرتا تو کیور ادب سے گردن جھکا کر تعمیل کر دیتا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے۔ اور حتی الامکان کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتا۔ ہورک نے بھی اس کی تعریف میں چند الفاظ مہمانوں سے کہے، لیکن میں نے اندازہ کیا کہ اندرونی طور پر ہورک اس شخص کیور کو پسند نہیں کرتا اور کسی قدر اس سے خائف رہتا ہے۔

اسی روز ہورک نے مجھے بتایا کہ کیور کی بیوی مر چکی ہے اور وہ اپنے دو لڑکوں کو لے کر کینن ہال میں ملازمت کے لئے آیا ہے۔ بڑے لڑکے ٹام کی عمر بارہ سال اور چھوٹا لڑکا ہنری دس سال کا تھا۔ کیور نے ان لڑکوں پر کوئی پابندی نہ لگائی، چنانچہ یہ بچے گاؤں کے لڑکوں میں جا کر کھیلتے اور بہت جلد سب میں گھل مل گئے۔

سردیوں کی ایک تاریک اور سرد رات تھی جب اس خوفناک حادثے کا آغاز ہوا جس نے ہورک کی زندگی تلخ کر دی۔ ہیلن کو علیحدہ ہوئے کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور ہورک اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کیفیت کو تمام نوکروں نے بھانپ لیا تھا اور وہ کوشش کرتے تھے کہ ہورک کے سامنے جانے کا زیادہ موقع نہ ملے۔ غالباً اس چیز کو سامنے رکھ کر کیور نے اپنے لڑکوں کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہورک کے کمرے میں آتش دان کی آگ مدھم نہ ہونے دیں۔

اس رات ہورک جب سونے کے لئے اس کمرے میں آیا تو اس نے دیکھا

کہ لیمپ بجھا ہوا ہے اور آتش دان بھی کچھ زیادہ روشن نہیں ہے۔ کیور کا ایک لڑکا آتش دان کی قریب کھڑا لوہے کی سلاخ سے راکھ کرید رہا تھا۔ ہورک کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر لڑکے کو اس زور کا طمانچہ مارا کہ بدنصیب لڑکا چکرا کر آتش دان میں گرا۔ اس کا سر پتھر کی دیوار سے ٹکرایا۔ ہورک نے چیخ کر کہا جلدی سے آتش دان میں کندے جھونکو اور لیمپ جلاؤ۔ مگر لڑکے نے کوئی حرکت نہ کی تب ہورک نے ٹھوکر مار کر لڑکے کو اٹھانے کی کوشش کی۔ مگر اس نے جنبش بھی نہ کی۔ یہ دیکھ کر ہورک غیظ و غضب سے کانپتا ہوا باہر نکلا اور اس نے دیکھا کہ برآمدے میں کیور کھڑا ہے۔

یہ کیا تماشا ہے؟.......... ہورک چلایا، آتش دان سرد پڑا ہے، اور لیمپ بھی بجھا ہوا ہے جاؤ اپنے لڑکے کی خبر لو۔ میں نے اسے ہلکا سا تھپڑ امارا تو وہ آتش دان کے پاس لیٹ گیا اور اب مکر کیے پڑا ہے۔

کیور نے ایک لفظ نہ کہا اور ہورک کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ چند منٹ بعد وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے آقا کے پاس آیا اور پرسکون لہجے میں کہا۔

"جناب! میرا لڑکا...... ٹام...... مر چکا ہے۔...... اس نے دم توڑ دیا ہے......

"مر گیا......" ہورک دہشت سے چلا اٹھا۔ خدا کی پناہ...... کیور، یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

"میں یہ عرض کر رہا ہوں سرکار کہ ٹام مر گیا۔ کیور نے پھر اس انداز میں جواب دیا۔ جیسے ڈنر تیار ہو جانے کا اعلان کر رہا ہو۔

ہورک کے اعصاب جواب دے گئے۔ دیر تک کوئی لفظ اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر کیور کو گھورتا رہا، پھر دھڑام سے زمین پر گرا۔ کیور نے

اسے سنبھالا اور اٹھا کر دوسرے کمرے میں لے گیا، ہورک کی حالت غیر تھی اس نے روتے ہوئے کہا۔

''کیور، خدا کے لئے مجھے معاف کر دو، میں نے تمہارے لڑکے کو جان بوجھ کر نہیں مارا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ہاتھ لگاتے ہی وہ آتش دان میں جا گرے گا۔

کیور نے اطمینان سے جواب دیا۔

''سرکار، جو ہونا تھا وہ ہو گیا، آپ کوئی رنج نہ کریں، ٹام میرا لڑکا تھا اور میں سب معاملہ سنبھال لوں گا۔ اب آپ یہاں آرام کریں اور کسی سے اس بارے میں کچھ نہ کہیں''

ہورک کو وہیں چھوڑ کر کیور اس کے کمرے میں گیا اور لڑکے کی لاش اٹھا کر اس جگہ لے آیا جہاں وہ رہا کرتا تھا۔ پھر اسی رات کیور نے ایک گھوڑا گاڑی منگوائی، لاش اس میں رکھی اور اپنے دوسرے لڑکے کو بھی ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔ تین ہفتے غائب رہنے کے بعد وہ واپس کینن ہال میں آیا اور ہورک کو بتایا کہ اس نے ٹام کو اس کی ماں کی قبر کے پاس دفن کر دیا ہے اور دوسرے لڑکے ہنری کو بعض رشتے داروں کے سپرد کر آیا ہے۔ ہورک نے بہت پوچھا کہ تمہارے رشتے دار کہاں رہتے ہیں تاکہ ہنری کے کل اخراجات وہاں بھیج دیے جائیں۔ مگر کیور نے اپنا منہ سختی سے بند کر لیا۔ اور ہورک کو پتہ نہ بتایا۔

آہستہ آہستہ دن گزرتے رہے، کیور دوسرے تیسرے ہفتے چھٹی لیتا اور کسی نامعلوم مقام پر روانہ ہو جاتا۔ دو، تین دن بعد واپس آتا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگ جاتا، ہورک کا خیال تھا کہ وہ اپنے بیٹے ہنری کو دیکھنے جایا کرتا ہے۔

ایک دن ہورک خلاف معمول میرے مکان پر آیا۔ میں اس وقت باہر

برآمدے میں بیٹھا پائپ پی رہا تھا۔ چند لمحے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ ایک لخت خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ خاصا فکرمند ہے۔ چہرے کا رنگ بھی کسی قدر اڑا ہوا ہے۔ اس سے پیشتر کہ میں کچھ کہوں...... وہ اچانک بول پڑا۔

"ڈاکٹر ماریسن، کیا آپ کو معلوم ہے کہ کیور کا لڑکا ٹام مر گیا؟

"کب؟ کیسے؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"معمولی سا حادثہ تھا، میں نے اسے طمانچہ مارا، وہ آتش دان میں گرا اور مر گیا"

تعجب ہے۔ لیکن یہ حادثہ کب پیش آیا؟

کوئی چھ ماہ قبل

"چھ ماہ قبل! مگر آپ نے پہلے ذکر کیوں نہیں کیا؟

"ذکر کرنے سے بھلا کیا فائدہ تھا"

"بندہ خدا، ہم لوگ کم از کم کیور سے چند تعزیتی کلمات ہی کہہ دیتے"

"ٹھیک ہے، لیکن کیور نے خود مجھ سے کہا تھا کہ اس حادثے کا ذکر کسی سے نہ کروں، وہ ٹام کی لاش یہاں سے لے گیا اور کسی جگہ دفنا آیا۔

اور ہنری کہاں ہے؟

کیور اسے اپنے چند رشتے داروں کے سپرد کر آیا ہے۔

"خدا رحم کرے"۔ میں نے کہا۔ بے چارے کیور کے لئے یہ صدمہ ناقابلِ برداشت ہو گا۔

"یقینی بات ہے۔ لیکن بظاہر اسے کوئی غم نہیں حسبِ معمول اپنے کام میں لگا رہتا ہے۔ ہمارے درمیان بس اتنی ہی بات ہوئی۔ اس کے بعد ہورک رخصت ہو گیا۔ میں دیر تک کیور کے بارے میں سوچتا اور ہورک کی بیان کی صداقت پر غور کرتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ آخر حادثے کے چھ ماہ بعد ہورک کو یہ خیال

کیوں آیا کہ مجھ سے ذکر کیا۔ بہر حال میں نے گاؤں میں کسی سے اس بارے میں بات نہ کی۔

دو مہینے گزر گئے۔ ایک رات میرے مکان کے آگے گھوڑا گاڑی رکی اس کا دروازہ کھلا اور میں نے دیکھا کہ ہورک باہر نکلا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے، میرے خادم نے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اندر کمرے میں لایا۔ پانی کے دو گلاس پی لینے کے بعد اس کے ہواس کچھ درست ہوئے۔

"ڈاکٹر مارلیسن، معاف کرنا، میں نے بے وقت آپ کو زحمت دی، مگر خدارا مجھے یہ بتاؤ، کیا میں پاگل ہوگیا ہوں؟ کیا میں فریب نظری کا شکار ہوسکتا ہوں؟ میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ کے اعصاب خاصے مضبوط ہیں"۔

پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ مجھے بھوت نظر آتے ہیں؟ اس نے مسکرا کر کہا۔ یہ مسکراہٹ بالکل بے جان اور بے اثر تھی۔

"بھوت؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "میں ان واہیات باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا"

ہورک دفعتاً اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے میرا بازو سختی سے تھام کر کہا۔

"مگر میں نے اسے دیکھا ہے۔ ڈاکٹر...... اپنی ان آنکھوں سے...... اور اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے"،

اس کی آواز کانپ رہی تھی اور آنکھوں سے خوف کا اظہار ہوتا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ کرسی پر بٹھایا۔ اور پوچھا۔

"آپ نے کیا دیکھا؟

"شام کو...... کیور کے لڑکے شام کو...... گزشتہ رات"

"کہاں، کس جگہ؟

اپنے مکان کینن ہال میں، ہورک نے جواب دیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر سسکیاں لینے لگا۔

"ڈاکٹر، مجھے پورا یقین ہے کہ وہی تھا......

"کینن ہال تو بہت بڑی عمارت ہے، آپ نے ٹام کو کس جگہ دیکھا تھا؟

"اپنے کمرے میں، آتش دان کے پاس......"

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟"

چپ چاپ...... بے حس و حرکت کھڑا تھا"

"اور اس وقت آپ کہاں تھے؟"

"میں گھوڑے کو اصطبل میں بندھوا کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ کیور میرے ساتھ تھا۔ جب میں کمرے کی بڑی کھڑکی کے سامنے پہنچا جہاں اونچے اونچے پودے لہلہا رہے تھے۔ تو دفعتہً کیور کے حلق سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ وہ ان پودوں پر جھکا اور چند سفید ریشمی دھاگے اٹھا کر میرے پاس لایا میں نے پوچھا۔ یہ کیا چیز ہے۔ تب اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"سرکار، یہ اس کپڑے کے دھاگے معلوم ہوتے ہیں جس میں میں نے اپنے بڑے لڑکے ٹام کو کفنایا تھا"

"عین اسی لمحے میری نگاہ کھڑکی میں سے ہو کر اپنے کمرے میں گئی اور میں نے دیکھا کہ آتش دان کے قریب ٹام کھڑا مجھے، گھور رہا ہے، خوف کے مارے میرا جسم پتھر کا ہو گیا۔ یہ کیفیت صرف چند ثانیے ہی قائم رہی۔ اس کے بعد میں نے کیور سے کہا کہ آتش دان کے نزدیک ٹام کھڑا تھا۔ یہ سن کر وہ حیرت سے میری طرف

دیکھنے لگا، پھر کمرے میں گیا اور کہنے لگا۔

"سرکار، یہاں تو کوئی بھی نہیں"

ہورک کی زبان یہ قصہ سن کر میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے اسے دماغی طاقت کی ایک دوا استعمال کرنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہورک اپنے ضمیر کی ملامت کے باعث پریشان ہے اور ٹام کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے گھومتی ہے۔ ابھی مشکل سے ایک ہفتہ گزرا ہوگا کہ ہورک دوبارہ میرے پاس آیا۔ اس مرتبہ اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی۔ چہرہ ہلدی کی مانند زرد تھا اور وہ خشک تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر، گذشتہ رات میں نے اسے پھر دیکھا ہے...... میں ڈائننگ روم سے گزر رہا تھا۔ کہ دفعتہً مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ڈائننگ روم کے دروازے کے ساتھ ہی سیڑھیاں ہیں۔ جب میں نے نگاہ اٹھائی تو وہ سب سے اوپر کی سیڑھی پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں تاروں کی مانند چمکتی تھیں اور سر ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ اف خدایا...... مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قلب کی حرکت بند ہو جائے گی۔ میں بے اختیار چیختا ہوا وہاں سے باورچی خانے کی طرف بھاگا۔ باورچن اس وقت ہاتھوں میں شوربے کا بھرا ہوا برتن لے کر آ رہی تھی اس نے مجھے اس حال میں دیکھا تو برتن اس کی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے کیور کو اس کے کوارٹر میں پایا۔ وہ فوراً میرے ساتھ ڈائننگ روم میں آیا، لیکن ٹام جا چکا تھا، کیور کہنے لگا کہ یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ مگر میں نے قسمیں کھا کر کہا کہ ابھی چند لمحے پہلے میں نے اسے سیڑھیوں پر کھڑے دیکھا ہے۔

میں نے ہورک کو گرم گرم قہوے کی ایک پیالی پلائی، تب اسے کچھ سکون

ہوا، پھر اس نے کہا

''ڈاکٹر، خدا کے واسطے میری مدد کرو...... میں واقعی اس معصوم بچے کا قاتل ہوں...... لیکن میں نے اسے جان کر نہیں مارا۔ وہ تو اتفاقی حادثہ تھا۔ اب اس کی روح زندگی بھر اسی طرح مجھے ستاتی رہے گی''

''کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کینن ہال میں رہنا چھوڑ دیں۔

''آہ...... ! یہ خیال میرے ذہن میں بھی آیا تھا۔ ہورک نے کہا۔ مگر اس میں کئی قباحتیں ہیں، اول تو یہ کہ گاؤں والے چہ می گوئیاں کریں اور دوم یہ کہ میں خواہ کہیں چلا جاؤں ٹام کی روح میرا تعاقب کرے گی''۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا، میرے پاس دراصل اسے تسلی دینے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اگلے روز میں نے کینن ہال جانے کا ارادہ کیا۔ اس کا مقصد کیور سے دو دو باتیں کرنا تھا۔ جب میں اپنی گھوڑا گاڑی سے اتر کر ان کوارٹروں کی طرف چلا جن میں نوکر رہتے تھے تو میں نے کیور کو دیکھا کہ صحن میں کھڑا لکڑیاں چیر رہا ہے جونہی اس کی میری آنکھیں چار ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری آمد سے خوش نہیں ہوا۔ بلکہ نہایت بیزاری سے جلدی جلدی کلہاڑا چلانے لگا۔ میں چند لمحے اس کے پاس کھڑا رہا اور جب اس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی، تب میں نے ڈھیٹ بن کر کہا۔

''کیور، میں تم سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں''

''جی فرمایئے؟''اس نے تلخ لہجے میں کہا،

تمہیں معلوم ہے کہ میں مسٹر ہورک کا پرانا دوست ہوں، بلکہ ان کا ذاتی معالج بھی ہوں۔ آج کل مسٹر ہورک ذہنی طور پر بہت زیادہ پریشان ہیں۔ اور مجھے ان کی جسمانی صحت کی طرف سے بھی خطرہ لاحق ہوتا جا رہا ہے، کیا تم بتا سکتے ہو کہ

اس کی وجہ کیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے، لیکن بہتر یہ ہے کہ آپ مسٹر ہورک ہی سے دریافت کیجیے۔

گزشتہ تین ماہ سے مسٹر ہورک کینن ہال میں کسی بدروح کو دیکھ رہے ہیں۔ اس کا ذکر انہوں نے مجھ سے کیا ہے، تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

میں نے کسی بدروح کو نہیں دیکھا اور نہ مجھے ان باتوں میں کوئی دلچسپی ہے۔ رہے تھے۔ میں خون کے گھونٹ پیتا ہوا چلا آیا۔ اگر میں کیور کی اس بدتمیزی کی خبر ہورک کو دیتا تو وہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتا۔ تاہم میں نے زبان بند رکھنا ہی مناسب سمجھا۔

چند روز بعد میں صبح صبح کینن ہال کی طرف گیا۔ گھوڑا گاڑی سے اتر کر وسیع لان میں داخل ہوا ہی تھا کہ ایک جانب ہورک اوندھے منہ پڑا دکھائی دیا، نرم گیلی زمین پر اس کے جوتوں کے نشان بھی عقب میں دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کہ ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ میں نے اسے اپنے کوچبان کی مدد سے اٹھایا۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔ نبض بے حد سست رفتار سے چل رہی تھی۔ اتنے میں کینن ہال کے کئی نوکر بھی آ گئے اور وہ اپنے آقا کو اٹھا کر بڑے کمرے میں لے گئے۔ چند لمحے بعد ہورک نے آنکھیں کھول دیں وہ برسوں کا مریض نظر آتا تھا۔ ایسا مریض جس کے جسم سے خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ اس نے اشارے سے سب نوکروں کو چلے جانے ک حکم دیا۔ جب کمرہ خالی ہو گیا۔ تو اس نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

"ڈاکٹر! میں نے کل رات اسے پھر دیکھا۔ میں اپنی خواب گاہ میں گیا اور بستر پر لیٹ کر کمبل اوڑھا ہی تھا کہ معاً دروازہ زور سے کھلا اور ٹام کھڑا دکھائی دیا۔ موم بتی کی ہلکی روشنی میں اس کا چہرہ سنگ مرمر کی طرح سفید، مگر بے جان نظر آتا

تھا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر مرکوز تھیں اور ان سے ناقابلِ بیان نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا تھا۔ دہشت سے میری چیخ نکل گئی۔ پھر میں نے سیڑھیوں میں سے کسی کے اترنے کی آواز سنی، میں بستر سے نکلا اور سوچے سمجھے بغیر سیڑھیوں کی طرف گیا، وہاں کوئی نہ تھا۔ اس وقت مجھے بالکل احساس نہ تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ جب میں لان میں آیا تو کچھ فاصلے پر ایک سایہ سا نظر آیا۔ میں اس کی طرف لپکا، مگر ٹھوکر کھا کر گرا۔ اس کے بعد اب ہوش آیا“۔

”اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ساری رات باہر لان میں بیہوش پڑے رہے۔

’جی ہاں‘

کیور کہاں ہے‘

”وہ تو کل دوپہر سے کہیں گیا ہوا ہے۔ آج سہ پہر تک آئے گا“۔

دو گھنٹے بعد پتہ چلا کہ کیور آ گیا ہے اور اس وقت اصطبل میں ہے میں اس کے پاس گیا اور ابھی کچھ کہنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ منہ پھیر کر چلا گیا۔

اس حادثے کے بعد میں پھر کینن ہال نہ گیا ہورک سے کبھی کبھار گاؤں میں ملاقات ہو جاتی، ٹام کی روح بدستور اسے پریشان کر رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ ہورک سوکھ کر کانٹا ہو رہا ہے۔ اس پر دیوانگی سی طاری رہنے لگی۔ اکثر شناساؤں کے قریب سے گزر جاتا اور انہیں نہ پہچانتا پھر ٹام کی موت کے ٹھیک ایک سال بعد میں نے سنا کہ ہورک نے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی، وہ بالکل پاگل ہو چکا تھا۔

ہورک کے مرتے ہی کینن ہال کے ملازم ایک ایک کر کے رخصت ہوئے، کیور بھی جا چکا تھا۔ اس کے بعد کینن ہال کے دروازے بند کر دیئے گئے اور آہستہ آہستہ لوگوں میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہونے لگیں۔ کینن ہال کو آسیب زدہ

قرار دے دیا گیا۔

ہورک کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کے اعصاب فولادی تھے۔ بھوت پریت پر اس کا قطعاً اعتقاد نہ تھا اور نہ وہ فریبِ نظر کا شکار ہوسکتا تھا۔ پھر یہ کیا بات تھی جس نے ہورک کو اس انجام پر پہنچایا؟ فرصت کے لمحات میں میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا، مگر سرا ہاتھ نہ آتا۔

ہورک کی موت کو چھ مہینے گزر گئے، ایک روز دوپہر کے وقت میں گھومتا پھرتا کینن ہال کی طرف جا نکلا، تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ میں عمارت کے چاروں طرف گھوما اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ اصطبل کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ میں اندر گیا ہر طرف گرد ہی گرد تھی اور مکڑیوں کے بڑے جالے تنے ہوئے تھے۔ گھوڑوں کے بے کار ساز، لوہے کے نال اور لید کا انبار بھی لگا تھا۔ میں واپس آنے ہی والا تھا کہ اچانک میری نگاہ ایک سیڑھی پر گئی جو اصطبل کے ایک گوشے میں اس پتھر نے ٹام کیور کی روح اور ہورک کینن کی خودکشی کا راز فاش کر دیا تھا۔

****

قبرستان سے واپس آ کر میں نے لوگوں سے کیور کے بارے میں پوچھا کہ کوئی اسے جانتا ہے۔ تقریباً ہر شخص نے اقرار کیا کہ کیور کو کون نہیں جانتا۔ وہ اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ مگر اب بہت دن سے نہ معلوم کہاں ہے۔ جب اس کی بیوی دو لڑکوں کو چھوڑ کر انتقال کر گئی تو کیور اپنے لڑکوں کو کہیں لے کر چلا گیا۔ پھر عرصے بعد وہ اپنے ایک لڑکے کی میت لے کر گاؤں میں آیا اور اپنی بیوی کی قبر کے پاس دفنا دیا۔ اس لڑکے کے بارے میں اس نے گاؤں والوں کو بتایا کہ وہ ایک حادثے میں مر گیا۔ چند روز گاؤں میں رہنے کے بعد وہ دوسرے لڑکے کو لے کر واپس چلا گیا۔ ایک سال بعد پھر لڑکے کے ساتھ واپس آیا اور بتایا کہ اس کا آقا خودکشی کر کے مر گیا

ہے۔سب نے افسوس کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ اب کیور یہیں رہے گا۔لیکن وہ پھر کہیں چلا گیا اور اب تک لوٹ کر نہیں ایا۔

اس مرحلے پر میں نے ڈاکٹر مارسین کی بات کاٹی اور کہا۔

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔کیور کے گاؤں والوں نے کہا کہ وہ لڑکے کو لے کر واپس چلا گیا۔آخر یہ کیسے ممکن ہے جبکہ......ڈاکٹر مارسین کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی،اس نے کہا۔

''آہ......یہی تو اصل راز ہے۔کینن ہال اور اس کے نواح میں رہنے والے لوگ یہی جانتے تھے کہ کیور دوسرے بیٹے ہنری کو اپنے گاؤں چھوڑ آیا ہے۔مگر یہ بات صحیح نہ تھی۔ہنری بلا شبہ اپنے باپ کیور کے ساتھ گیا تھا۔لیکن وہ زندہ نہیں تھا،بلکہ کیور اسے وہاں دفن کرنے گیا تھا اور وہ اسی لڑکے کی قبر تھی جسے میں نے دیکھا۔پتھر پر ہنری کیور کا نام،عمر اور تاریخ وفات درج تھی۔اس کا مطلب یہ تھا کہ کینن ہال میں ہورک کے ہاتھوں جو لڑکا مارا گیا تھا،وہ ٹام نہیں ہنری تھا''

میں حیرت سے ڈاکٹر مارسین کا منہ تکنے لگا۔

''خدا کی پناہ......میں چلا اٹھا۔اس کے معنی یہ ہیں کہ......''

''جی ہاں،اس کے معنی یہ ہیں کہ کیور نے نہایت عمدہ ناٹک رچایا۔آپ کو یاد ہوگا کہ ہورک نے جب لڑکے کو طمانچہ مارا اور وہ آتش دان میں جا گرا تو اس وقت ہورک نے لڑکے کی شکل نہ دیکھی تھی اور جب وہ مر گیا تب بھی ہورک اس کی صورت دیکھنے نہ پایا۔جب اس نے کیور سے اس حادثے کا ذکر کیا اور وہ کمرے کے اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ ہنری مرا پڑا ہے اور اس مختصر سے وقفے ہی میں کیور نے اپنے آقا سے انتقام لینے کی انوکھی تدبیر سوچ لی۔اس نے باہر آکر ہورک کو بتایا کہ ٹام مر گیا۔پھر وہ ہنری کی لاش لے کر اپنے گاؤں میں گیا اور ٹام کو بھی ساتھ لے گیا۔

کچھ عرصے بعد ٹام کو واپس لے آیا اور اسے اصطبل میں بنی ہوئی خفیہ کوٹھڑی میں چھپا دیا۔ پھر اس نے لڑکے کو پڑھا سکا کر بدروح میں تبدیل کر دیا اور یوں ایک سال تک ہورک کو عذاب میں مبتلا کیے رکھا۔ حتیٰ کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ ہے داستان کینٹن ہال کے آسیب کی جو چالیس برس سے گاؤں میں مشہور ہے‘‘

☆☆☆

بھٹکتی روح

(مقبول جہانگیر)

یہ ۱۹۳۲ء کی ایک صبح کا ذکر ہے چھوٹی سی داڑھی خاموش کھوئی ہوئی آنکھیں اور چھریرے بدن والا ایک شخص مارٹن ہسپتال کے منتظم اعلیٰ کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے نوکری کی درخواست پیش کی، جس کے ساتھ طب کی نو اعلیٰ ڈگریاں منسلک تھیں۔ اس کا نام ڈاکٹر دان کوزل تھا۔ اسے ہسپتال میں ایکس رے سپیشلسٹ کے فرائض سونپ دیئے گئے۔ آدمی محنتی تھا۔ جلد ہی ہسپتال میں اس نے اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلیا۔ ہسپتال کے ادنیٰ سے ادنیٰ ملازموں سے لے کر افسران بالا تک اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے۔ اسے اس طرح کام کرتے ہوئے ایک سال گزر گیا مگر آج تک کسی کو معلوم نہ ہوسکا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ وہ تنہا تھا اور اس نے ہسپتال سے کچھ فاصلے پر ایک خوبصورت سا مکان کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک میں اس نے اپنی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی اور دوسرا حصہ رہائش کے لئے مخصوص تھا۔ فارغ اوقات میں اپنی تجربہ گاہ میں مختلف قسم کے تجربات کرنے میں گھنٹوں مصروف رہتا۔ بعض اوقات وہ رات کو سونا بھی بھول جاتا۔ جب ہسپتال میں بیکار بیٹھا ہوتا تو اس کی آنکھوں میں جھانکنے سے یوں محسوس ہوتا کہ کسی اہم مسئلے پر سوچ بچار کر رہا ہے۔ اکیلے بیٹھے ہوئے اسے کئی دفعہ لوگوں نے بڑبڑاتے ہوئے بھی سنا۔ بیٹھے بیٹھے وہ کبھی ہنسنے لگتا اور ہنستے ہنستے یک بارگی اس کے چہرے پر غم کے گھنیرے سائے پھیل جاتے۔ لوگوں نے اکثر اوقات اسے اس حالت میں دیکھا مگر جب بھی کوئی اس کے متعلق دریافت کرتا تو وہ ایک حسرت بھری مسکراہٹ سے گفتگو کا موضوع بدل دیتا۔ اگست ۱۹۳۲ء کا دن خاصا گرم تھا۔ صبح ہی

سے فضا میں تیزی تھی اور سورج دیوتا اپنے سنہری رتھ میں بیٹھا جوں جوں نیلے آکاش کی بیکراں وسعتوں میں محو خرام ہوا۔توں یوں لوگ گرمی کی شدت محسوس کرنے لگے۔ڈاکٹر دان کوزل حسب معمول اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، وہی پُراسرار خاموشی، وہ سائنس کے ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔اسی اثناء میں کسی کے قدموں کی چاپ اس کے دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔آنے والے نے دروازے کا پردہ اٹھایا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔وہ ایک لڑکی تھی۔دنیا و مافیہا سے بے خبر، وہ لڑکی کچھ دیر تک ڈاکٹر کو دیکھتی رہی، ڈاکٹر بدستور گردن جھکائے رسالہ پڑھنے میں منہمک تھا۔لڑکی اس کی میز کی قریب آ کر رکی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ڈاکٹر نے رسالہ ایک طرف رکھتے ہوئے کاغذ پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ڈیوٹی پر حاضر ڈاکٹر نے لکھا تھا۔

نام: ایلنا میلا

تشخیص: مثبت مرض

"براہ مہربانی مریضہ کے سینے کی ایکس رے رپورٹ پیش کی جائے"۔

فارم پڑھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنی اُداس آنکھیں اٹھائیں۔سامنے نوجوان لڑکی کھڑی تھی، جس کے چہرے پر بیماری کی وجہ سے زردی جھلک رہی تھی۔اس کے بالوں کی ایک شریر لٹ اس کی پیشانی کو چوم رہی تھی۔ڈاکٹر ٹکٹکی باندھی اسے دیکھتا رہا، اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ جس کے لئے وہ آج تک سرگرداں رہا وہ اسے مل گئی ہے، بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا "تم" اس کی آواز پُراسرار سرگوشی کے سے انداز میں کمرے کی خاموش فضا میں ابھری، "آخر تم واپس آ گئیں نا" ڈاکٹر آہستہ آہستہ اپنی کرسی سے اٹھا وہ اب بھی اس کی طرف پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہا تھا۔۱۹۰۹ء کا وہ موسم بہار تو تم کو یاد ہوگا جب تم مجھے کمپوس سانتوس پارک

کے اس سنسان گوشے میں ملیں تھیں۔ اور پھر...... ڈاکٹر کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی اور پھر ہم نے اکٹھے بیٹھ کر ٹھنڈا شربت پیا تھا۔ وہاں سے اٹھ کر ہم اپنے کمرے......

لڑکی اپنی گھبراہٹ کو چھپاتے ہوئے مسکرائی۔ میرا خیال ہے آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے، ڈاکٹر، اس کی آواز میں جلترنگ کا سا نغمہ تھا۔ ۱۹۰۹ء میں میں آپ سے کس طرح مل سکتی تھی۔ اس وقت تو میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھی''۔

ڈاکٹر کے ماتھے پر حیرانی اور غصے کی ملی جلی شکنیں ابھریں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اسے کسی حسین خواب سے جھنجھوڑ کر جگا دیا گیا ہے۔ ناک پر کھسکی ہوئی عینک کے شیشوں میں سے اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اپنے سر کو معنی خیز انداز میں جنبش دیتے ہوئے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ یکا یک اس کے ماتھے پر پھیلی ہوئی حیرت اور آنکھوں کی چمک غائب ہوگئی۔ اب اس کے چہرے پر وہی وقار اور متانت تھی اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''معاف کیجیے۔ مجھے دھوکا ہوا۔ تم بالکل اس سے ملتی جلتی ہو، چند لمحوں کے لئے وہ خلا میں گھورتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ''عجیب حماقت ہے، یہ لڑکی کیا سوچتی ہوگی۔ اس احساس نے اسے جھنجھوڑا اور اس نے لڑکی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کپڑے اتار کر پردے کے سامنے آجائیے۔

گلاب کی نازک پنکھڑی ایسے ہونٹوں پر پسینے کے ننھے قطرے موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ اس کے عارض جن پر بیماری کی وجہ سے زردی کی آثار نمودار تھے گہرے سرخ ہوگئے تھے۔ وہ بالکل بوکھلا گئی تھی۔ کنکھیوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بلاؤز کے بٹن کھولنے لگی۔ ڈاکٹر نے ایکس رے مشین کے پرزوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ نے کپڑے اتار دیئے ہیں؟

''جی ہاں'' لڑکی کی سہمی ہوئی آواز کمرے کی خاموش فضا میں کپکپائی۔

''اچھا آپ پردے کے سامنے کھڑی ہو جائیں۔ کندھوں کو جھکا رہنے دیجئے۔ ٹھوڑی کو ذرا اوپر کیجئے۔ لڑکی نے اپنے چہرے کو ذرا اوپر اٹھایا۔ لاکھ چھپانے کے باوجود گھبراہٹ اب بھی اس کی آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔

''گھبرایئے نہیں۔ اچھا اب ایک لمحہ کے لئے سانس روکئے اور ہلیے گا نہیں''

دوسرے لمحے مشین کی تیز لہریں لڑکی کے جسم سے گزتی ہوئی نکل گئیں، شکریہ، ڈاکٹر نے حسب معمول کہا۔ لڑکی نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ قدموں کی آواز آہستہ آہستہ دھیمی ہوتی ہوئی بالکل خاموش ہو گئی۔ بڑے بوجھل انداز میں ڈاکٹر اپنی کرسی میں دھنس گیا۔ وہ سوچتا رہا۔ یہ لڑکی کون تھی۔ یقیناً یہ وہی لڑکی تھی جو مجھے ۱۹۰۹ء میں پارک میں ملی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ایکس رے پلیٹ اندھیرے کمرے میں لے گیا۔ جب سکرین دھل کر تیار ہو گئی تو اس نے برقی قمقمے کی تیز روشنی میں دیکھا۔ لڑکی کا بایاں پھیپھڑا تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ گول گول چھوٹے بڑے زخموں کے نشان سکرین پر نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ اسے تپدق ہے اور وہ بھی اب تیسرے درجے میں داخل ہو چکی ہے۔ یہ تو مر جائے گی۔ ڈاکٹر اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔

ڈاکٹر وان کوزل ایکس رے پلیٹ ڈاکٹر انچارج کے پاس خود لے کر گیا۔ آیئے، آیئے آپ نے یہ کیوں تکلیف کی۔ چپراسی کے ہاتھ بھیج دی ہوتی۔ ڈاکٹر انچارج نے آج خلافِ معمول اسے ایکس رے روم سے باہر دیکھ کر کہا۔ بس یونہی۔ وان کوزل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ڈاکٹر انچارج سے باتوں باتوں میں ایلنا کے متعلق پوچھنے لگا۔

ڈاکٹر انچارج نے ایک سرد آہ بھری اور کہنے لگا۔

"ڈاکٹر کوزل! یہ لڑکی بھی بہت ہی بدنصیب ہے، میں اس کے باپ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی اس کے حریص باپ نے دولت کی خاطر اس کی شادی ایک بوڑھے اوباش سے کردی اور اس غریب نے اف تک نہ کی، اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا اور پیدائش کے ایک ہفتے بعد وہ مرگیا۔ یہ بدنصیب لڑکی اپنے بچے کے غم میں ایسی بیمار ہوئی کہ اسے تپدق ہوگئی، اور آج یہ حالت ہے کہ اس کا ایک پھیپھڑا بالکل ختم ہو چکا ہے اور دوسرے میں جراثیم اپنا گھر بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے ایکس رے پلیٹ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر کوزل خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ڈاکٹر کوزل اب اپنا فارغ وقت اپنی تجربہ گاہ کی بجائے ہسپتال کی لائبریری میں گزارتا۔ تپدق پر جتنی بھی کتابیں میسر آسکیں، اس نے پڑھ ڈالیں اور جب ان سے بھی اس کی پیاس نہ بجھی تو اس نے قدیم طب کی چھان پھٹک شروع کردی۔ اس کی اس غیر متوقع تبدیلی کو دیکھ کر ہسپتال کے عملے میں چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔

ایلنا علاج کے لئے اکثر ہسپتال آیا کرتی تھی۔ اسے دیکھتے ہی کوزل کی ویران آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک عود کر آتی۔ ایلنا موت سے قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ اور کوزل اپنی پراسرار محبت کے درد کے ہاتھوں نیم بسمل ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ بہت خاموشی سے ہورہا تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکٹر کوزل اس عمر میں بھی ایک مرنے والی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہے۔

ایک دن ڈاکٹر انچارج ایلنا کے باپ سے کہہ رہا تھا۔ "دیکھئے، زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے مگر مجھے یہ بتاتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ایلنا کو اب کوئی دوا موت کے منہ سے نہیں بچاسکتی اور اگر یہ بچ گئی تو یہ ایک معجزہ سے کم نہ ہوگا۔

وقت گزرتا گیا۔ ایلنا اب اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ اٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ وہ ہر وقت کھانستی اور خون تھوکتی رہتی، اب اس نے ہسپتال آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

ستمبر کی ایک سرد رات تھی، رات کے نو بجے تھے۔ ڈاکٹر دان کوزل نے ایلنا کے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ لڑکی کے باپ نے دروازہ کھولا۔ ڈاکٹر کوزل کو اس وقت اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ آپ یہاں؟ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ سفید سوٹ میں ملبوس، ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ لئے ہوئے، ڈاکٹر مسکرا رہا تھا، ایک طویل عرصے بعد آج اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔

''میرا خیال ہے آپ ایلنا کے والد ہیں''

''جی ہاں، جی ہاں، اس نے حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں ایلنا سے ملنے آیا ہوں۔ کیا وہ گھر پر ہے؟

''ہاں، ایک دو دن سے اس کی طبیعت ذرا سنبھلی ہے۔ اب تو وہ چل پھر بھی سکتی ہے'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایلنا کو آواز دی۔

وہ بال بکھرائے اور پیروں میں سلیپر اٹکائے ہوئے آ گئی۔ کیا میں اندر آ سکتا ہوں'' کوزل نے اسے دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔

لڑکی نے باپ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ ہاں۔ ہاں۔ ضرور آ سکتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ لڑکی کے بیمار چہرے پر معصوم مسکراہٹ ابھری۔ لڑکی تیز تیز قدم چلتی ہوئی اپنے کمرے میں گئی۔ ادھر اُدھر بکھری ہوئی چیزوں کو جلد جلد قرینے سے رکھا، اور کرسیوں کو جھاڑا۔ اتنے میں ڈاکٹر اور اس کا باپ کمرے میں آ چکے تھے۔ ''آیئے، بیٹھیے'' لڑکی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لڑکی کا والد دروازے میں کھڑا ہوا تھا، اس کی آنکھوں سے بے چینی اور اضطراب مترشح تھا۔

”آپ ایلنا کے علاج کے لئے آئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب؟ اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے اپنی سفید چھوٹی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا، ”نہیں“ میں تو ذرا مزاج پرسی کے لئے آیا تھا“

”ڈاکٹر، شائد آپ کو علم نہیں کہ ایلنا شادی شدہ ہے۔ لڑکی کے باپ کی آواز میں غصے کی جھلک تھی۔ کوزل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مجھے معلوم ہے، میں ایلنا کے متعلق اس بات سے بھی زیادہ جانتا ہوں، پھر ڈاکٹر نے ایلنا اور اس کی والد کو تمام کہانی سنائی کہ کس طرح ماضی میں اسے ایک لڑکی ملی تھی جس کی شکل ایلنا سے ملتی تھی۔ اچانک وہ لڑکی غائب ہوگئی تھی اور اس کے انتظار میں اس نے دنیا کی تمام خوشیوں اور مسرتوں سے کنارہ کرلیا۔ اور آج ایلنا اس کا رُوپ دھارے اس کی سامنے بیٹھی تھی۔

ایلنا اور اس کا والد یہ سن کر بہت متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ ”بچی، شائد تم محسوس نہ کرسکو کہ میری روح کس طرح اس کی تلاش میں بھٹک رہی ہے“۔

لڑکی کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ اس نے کہا ”میں جانتی ہوں ڈاکٹر۔ مجھے احساس ہے۔

اس مختصر سی ملاقات کے بعد ڈاکٹر چلا گیا اور پھر وہ روزانہ ایلنا کے علاج کے لئے آنے لگا۔ لڑکی کی صحت ٹھیک ہونے لگی۔ ڈاکٹر کی یاس بھری آنکھوں میں اُمید کے دیئے جگمگا اٹھے، مگر کسی کو کیا معلوم تھا کہ بجھتی ہوئی شمع کی یہ آخری لو ہے۔ نومبر کی ایک سرد رات کو مجھے کھانسی کا شدید دورہ پڑا اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوگئی۔ ایلنا کے ماں باپ سر پیٹ کر رہ گئے۔ مگر ڈاکٹر کوزل کا غم ان سے زیادہ تھا۔ اسے جس

روح سے پیار تھا وہ اسے ایک دفعہ پھر تنہا چھوڑ کر عالم ارواح کی طرف جا چکی تھی۔

تجہیز و تکفین کے وقت وہ پھر سے پنڈال میں اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے ایک ایک سے فریاد کی کہ جنازے کی تجہیز و تکفین کا تمام انتظام وہ اپنی گرہ سے اپنے زیر نگرانی کروائے گا۔اس کی حسرت بھری فریاد کو کوئی بھی نہ ٹھکرا سکا۔ ٹوٹے ہوئے دل کو تھامے ہوئے ڈاکٹر نے تمام کام اپنی زیر نگرانی کروایا اور سہ پہر کے قریب مقامی قبرستان میں صنوبر کے گھنیرے سائے تلے ڈاکٹر نے اپنی ڈبڈباتی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے تابوت قبر میں اتارا۔

اس واقعہ کو دو سال کا عرصہ گزر گیا۔جو لوگ کوزل کو قریب سے جانتے تھے، انہوں نے محسوس کیا کہ دو سال کے اس قلیل عرصے میں ڈاکٹر میں بہت زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔وہ گھنٹوں اپنے محبوب کی قبر پر جا کر بیٹھا رہتا ہے۔عموماً لوگوں نے اسے قبر سے باتیں کرتے ہوئے سنا۔

''تم چلی گئیں نا مجھے چھوڑ کر''

''مجھے معلوم ہے تم مجھے تنگ کرنے کے لئے یہاں آ کر چھپ گئی ہو''

''میں جلد ہی تمہاری روح کو موت کے پنجے سے چھین لوں گا۔تم مطلق فکر نہ کرو۔میں ایسی دوائی تیار کر رہا ہوں''

قبر کے پاس بیٹھے بیٹھے کبھی وہ معصوم بچوں کی طرح مچلتا، روتا سسکیاں بھرتا اور کبھی کبھی قہقہے مار کر ہنس پڑتا۔

اب وہ رات گئے تک بڑے عجیب و غریب تجربات کرتا رہتا۔اگر اس کے ساتھی ڈاکٹر پوچھتے، ''حضرت'' آج کل کس تھیوری پر تجربات کئے جا رہے ہیں تو اس کی ویران آنکھوں میں سوچ کے بادل اور گہرے ہو جاتے''

''میں، میں ایک ایسا تجربہ کر رہا ہوں جو میری زندگی کا ایک عظیم کارنامہ ہوگا'' یہ کہتے کہتے وہ دور خلاؤں میں گھورنے لگتا۔اس کے ساتھی ڈاکٹر مسکرا کر چلے

جاتے اور اس کو ان کے جانے کی خبر نہ ہوتی۔

ان مصروفیات کے باوجود وہ اپنے وقت کا ایک حصہ ایلنا کے ماں باپ کے گھر گزارتا۔ ایک دن اس نے مرحوم ایلنا کے باپ سے کہا۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔

"کہیے۔ ایلنا کے باپ نے اپنی کرسی اس کے قریب لاتے ہوئے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"ایلنا اس بے رحم آسمان کے سائے تلے سوئی ہوئی ہے۔ برفباری، بارش، دھوپ ہمیشہ سے پریشان کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اس کی قبر پر ایک حسین سا مقبرہ بنا سکوں تو مرتے وقت مجھے اطمینان تو ہوگا کہ معصوم ایلنا میرے بعد دھوپ اور برف سے محفوظ رہے گی۔ ڈاکٹر نے یہ سب کچھ، کچھ اس دکھ بھرے لہجے میں کہا کہ ایلنا کا باپ انکار نہ کرسکا۔

اور اب ڈاکٹر کوزل، ڈاکٹر سے معمار بن گیا تھا۔ سب سے پہلے اس نے قبرستان میں ایک عمدہ سی پُرسکون جگہ قیمتاً خریدی۔ سنگ مرمر، شیشے اور دوسرے لوازمات اکٹھے کیے اور اپنی محبت کا تاج محل تعمیر کرنا شروع کردیا۔ ایلنا کی دوسری برسی سے پہلے مقبرہ تیار ہوچکا تھا۔ برسی کے دن ایلنا کا پہلی قبر سے تابوت نکالا گیا اور مقبرے میں بنائی قبر میں دفن کردیا گیا۔ مقبرے کی چابی ڈاکٹر نے اپنے پاس رکھی اور ایلنا کے لواحقین نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

قبرستان کے نگہبان اس سے کافی مانوس ہوچکے تھے۔ شام سے پہلے وہ آجاتا، خاموشی سے مقبرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا اور دروازہ اندر سے بند کرکے بیٹھ جاتا۔ جب رات گئے قبرستان کے نگہبان گشت کے لئے نکلتے تو ان کو مقبرے سے وائلن کے درد بھرے نغمے سنائی دیتے اور اس دردانگیز موسیقی کے ساتھ

ساتھ قبرستان کی پراسرار خاموشی اور بھیانک ہو جاتی۔

ایک روز پہرے دار رات گئے، قبرستان کی آخری گشت پر نکلا تو اسے مقبرے سے یکا یک درد بھری موسیقی کی آواز سنائی دی۔ پہلے تو پہرے دار نے خیال کیا کہ ڈاکٹر اندر ہوگا مگر جب اس نے دیکھا کہ دروازے پر قفل پڑا ہوا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دروازے کے سوراخوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ اندر اندھیرا تھا اور موسیقی کی آواز بدستور آ رہی تھی۔ وہ بھاگا ہوا دوسرے پہرے داروں کے پاس گیا۔ اکھڑے اکھڑے سانس میں اس نے پر اسرار موسیقی کے متعلق بتایا۔ دوسرے پہرے داروں نے بھی آ کر وہ موسیقی سنی، مگر لاکھ کوشش کے باوجود انہیں مقبرے کے اندر کوئی دکھائی نہ دیا۔ صبح ہوتے ہی وہ موسیقی ختم ہو گئی۔ دوسرے دن ڈاکٹر مقبرے پر آیا تو حیران پریشان پہرے داروں نے اسے تمام قصہ سنایا۔

''ہاں، میں نے ایک ریڈیو یہاں لگا دیا ہے اور اسے میں گھر پر بیٹھا ہوا کنٹرول کرتا ہوں۔ جب سوچتا ہوں کہ ایلنا تنہائی محسوس کر رہی ہوگی تو اسے درد بھری موسیقی سنا دیتا ہوں''

ڈاکٹر نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ پہرے داروں کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ تم اس پر حیران ہو؟ اس نے پہرے داروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے تو ایک ٹیلی فون بھی یہاں لگا دیا ہے جب اپنے محبوب سے باتیں کرنے کو دل چاہتا ہے اس سے باتیں کر لیتا ہوں'' اس نے حسب معمول دروازہ کھولا اور مقبرے میں داخل ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔

اچھا اب جاؤ مجھے اس سے ملنا ہے۔ اس نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ پہرے دار الٹے قدموں واپس ہو گئے۔

پاگل ہوگیا ہے پاگل۔ایک نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

''مجھے تو کوئی جادوگر دکھائی دیتا ہے۔دوسرے نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''دل کے معاملے کچھ دل والے ہی جان سکتے ہیں یارو۔تیسرے نے تان توڑی اور تینوں اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں واپس آ گئے۔

۱۹۳۴ء میں موسم بہار کی ایک روپہلی صبح کو۔کی ویسٹ کے جنوبی ساحل پر آسمان کی بلندیوں میں ایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔لوگوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پرائیوٹ جہاز نذرِ آتش ہوگیا اور نیچے گر پڑا۔جہاز اس بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا کہ اس کا بننا اب ناممکن تھا۔جب ڈاکٹر کوزل کو اس حادثے کی اطلاع ملی تو وہ جائے حادثہ پر پہنچا اور ٹوٹے ہوئے جہاز کو دیکھ کر اس کے دل میں ایک عجیب سی امنگ پیدا ہوئی۔طیارے کو خریدنے کی امنگ۔اس نے کمپنی سے یہ طیارہ سستے داموں خرید لیا اور اسے ایک ٹرک کے ذریعے گھسٹواتا ہوا ہسپتال کی احاطے میں لا کھڑا کیا۔ہسپتال کے افسرانِ اعلیٰ نے اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ طیارے کو کچھ دنوں کے لئے احاطے میں کھڑا کرلے۔نومبر کی ایک رات کو طیارہ غائب ہوگیا۔ڈاکٹر رات کے وقت اسے کسی مشین کے ذریعے کھینچتا ہوا اپنے گھر کی قریب لے آیا تھا۔اب ڈاکٹر زیادہ وقت کے لئے طیارے کی مرمت میں مصروف رہتا۔ اس نے اب قبرستان جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔جب اس کے احباب کو اس تبدیلی کی اطلاع ملی تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔وہ کہتے

آخر مُردے سے انسان کب تک پیار کرسکتا ہے۔

لوگ دھیرے دھیرے ماضی کے قصے بھولنے لگے۔سات سال کا عرصہ گزر گیا اور کسی کے ذہن میں خیال تک نہ آیا کہ ڈاکٹر کوزل انسانی جرائم کی تاریخ میں نہایت ہی بھیانک جرم کا مرتکب ہو رہا ہے۔کسی کو بھی یہ احساس نہ ہوا کہ ڈاکٹر

کوزل آج کل اپنی تجربہ گاہ میں مافوق الفطرت قسم کے تجربات کر رہا ہے اور لوگوں کو معلوم بھی نہ ہوتا اگر اتفاقیہ طور پر ایک گورکن اس راز کو نہ پالیتا۔

۵ اکتوبر ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے۔ ایلنا کے مقبرے سے کچھ فاصلے پر ایک قبر کھودی جارہی تھی۔ ایک گورکن نے دیکھا کہ ایلنا کے سنسان مقبرے کی کھڑکی سے پرندے کبھی اندر جاتے ہیں اور کبھی باہر نکلتے ہیں۔ وہ ٹہلتا ٹہلتا کھڑکی کے پاس گیا اور سوراخ سے اندر جھانک کر دیکھا تو اسے عجیب منظر نظر آیا، قبر اکھڑی ہوئی تھی۔ تابوت کا ڈھکنا ایک طرف پڑا ہوا تھا اور تابوت میں سے روشنی غائب تھی۔ جلد ہی قبرستان کی انتظامیہ کو مطلع کیا گیا۔ انتظامیہ کے افسر مسٹر ولیم سائیر نے ایلنا کی بڑی بہن مسز میڈینا کو تمام حقائق سے مطلع کیا۔ مسز میڈینا نے ہسپتال کے دفتر سے ڈاکٹر کوزل کے گھر کا پتہ دریافت کیا اور اسی رات اس کی گھر گئی۔ دھڑکتے دل سے اس نے دروازے پر دستک دی، اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ مسز میڈینا نے دوسری بار دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنائی دی اور دوسرے لمحے ڈاکٹر کوزل اس کی سامنے تھا۔

''ہاں''۔ وان کوزل مکمل سوالیہ نشان بنتے ہوئے بولا۔

مسز میڈینا نے کہا۔ میں آپ سے ملنے آئی ہوں۔ لاکھ کوشش کے باوجود اپنی کپکپاہٹ نہ چھپا سکی۔

''اچھا، پھر؟'' وان کوزل نے کھوئے ہوئے انداز میں پوچھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی بہت اہم مسئلے پر غور کر رہا ہے اور اس وقت دماغی طور پر حاضر نہیں۔

''دروازے پر کھڑے کھڑے آپ پوچھ رہے ہیں'' اب مسز میڈینا کافی حد تک اپنی گھبراہٹ پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کیا اندر نہ

بلا یئے گا۔

اداس آنکھوں میں چمک کی ایک ہلکی سی لہر ابھری، بھئی آ جایئے۔ اس نے بوجھل انداز میں کہا اور دروازے سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ مسز میڈینا نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کے اندر قدم رکھا، چھوٹا سا صحن عبور کر کے وہ ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ ڈاکٹر کی تجربہ گاہ تھی۔ دوائیوں کی عجیب قسم کی بو نے ان کا استقبال کیا۔ ڈاکٹر مسز میڈنیا کے آگے آگے سر جھکائے جا رہا تھا۔ تجربہ گاہ سے گزرتے ہوئے وہ ایک چھوٹے سے تاریک کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے کے دائیں طرف ایک بڑا سا ہال کمرہ تھا۔ اس میں بھی اندھیرا تھا۔ دونوں اس میں داخل ہو گئے۔ ڈاکٹر نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ دبایا۔ کمرہ نیلی روشنی میں عجیب سا دکھائی دینے لگا۔

"میں آپ کے پاس آئی تھی..... یہ کہتے ہی مسز میڈینا کی نگاہ سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی ایک تصویر پر پڑی۔ یہ ایلنا کی تصویر تھی۔ تصویر کے اردگرد فریم کے ساتھ ساتھ سیاہ بالوں کی لٹیں لٹک رہی تھیں۔ اس کی زبان ایک دم رک گئی اور اسے اپنے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"ہاں تو آپ کیا کہہ رہی تھیں، ڈاکٹر کی آواز گونجی۔

"مسز میڈینا نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔" میں آپ کے پاس مقبرے کی چابی لینے آئی تھی۔

وان کوزل کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلے۔ محترمہ۔ چابی میری ہے اور ایلنا سراپا میرے لئے تھی۔ اگر میں اس کے مقبرے پر نہیں جاتا تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اسے بھول گیا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے آرام میں خلل آئے۔

مسز میڈینا نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر۔ وہ آخر میری بھی

بہن تھی ۔ مجھے بھی اس سے کچھ کم پیار نہیں ۔ یہ کہتے ہوئے اس نے کمرے کا جائزہ لیا ۔ اس کی نظر کمرے کے ایک کونے میں رکھے ہوئے پلنگ پر مرکوز ہو کر رہ گئی ۔ پلنگ پر بچھا ہوا بستر اس نے ایک ہی نگاہ میں پہچان لیا ۔ یہ ایلنا کا بستر تھا آج سے نو سال پہلے وہ اس بستر پر سویا کرتی تھی ۔ مسز میڈینا پوری طرح بوکھلا چکی تھی ۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے شفاف قطرے نمودار ہو گئے ۔ ڈاکٹر ۔ اگر تکلیف نہ ہو تو ایک گلاس پانی لا دیجئے ۔ میری طبیعت گھبرا رہی ہے ۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ۔ ڈاکٹر اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا ۔ مسز میڈینا فوراً اپنی کرسی سے اٹھی، بستر کے پاس گئی پلنگ دو حصوں میں منقسم تھا ۔ ایک حصے میں کوئی چادر تانے سو رہا تھا ۔ مسز میڈینا نے ذرا سا کپڑا سرکا کر دیکھا اور اس کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی ۔ یہ ایلنا کی لاش تھی ۔ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مڑی اور بے تحاشا بھاگنے لگی ۔ کمرے کے دروازے پر اسے ڈاکٹر ملا اس نے تیزی سے ڈاکٹر کو دھکا دیا ۔ ڈاکٹر لڑکھڑایا اور دیوار کا سہارا لینے کے باوجود پانی کے گلاس سمیت فرش پر گر پڑا ۔ وہ بھاگتی ہوئی سڑک پر آ گئی ۔ اب اس کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا ۔

تھوڑی دیر بعد پولیس انسپکٹر گرفتاری کے وارنٹ لئے ڈاکٹر وان کوزل کے

دروازے پر کھڑا تھا ۔ پولیس نے تمام گھر کا محاصرہ کر لیا ڈاکٹر، انسپکٹر کو دیکھتے ہی چیخ اٹھا نہیں ۔ آپ اندر نہیں آ سکتے ۔ آپ کو اندر نہیں آنا چاہیے ۔

انسپکٹر اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گیا ۔ مسز میڈینا اور چند سپاہی اس کے ساتھ تھے ۔ وہ سیدھا ہال کمرے میں گئے ۔ ڈاکٹر نے بڑھ کر ایلنا کے مردہ جسم پر سے چادر ہٹا دی ۔ ایلنا نے ہلکے نیلے رنگ کا ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا اور اس کے نیچے خوبصورت پھولوں والا پیازی رنگ کا بلاؤز اور گہرے نیلے رنگ کا سکرٹ ۔ انسپکٹر نے مڑ کر ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے مخصوص پولیس والوں کے

کرخت لہجے میں کہا۔

''یہ کیا شیطانی کھیل کھیلا جا رہا تھا ڈاکٹر۔

ڈاکٹر نے ایک سرد آہ بھری اور کہنا شروع کیا۔ اتنا شور کیوں مچاتے ہو۔ تم اس کے آرام میں مخل نہ ہو، وہ مری نہیں ہے''

''بکومت صحیح صحیح بتاؤ''

''یہ سوئی ہوئی ہے۔ جناب۔ ڈاکٹر نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ابھی ہم لوگوں کو کچھ عرصہ صبر کرنا پڑے گا۔ یہ جلد ہی جاگ اٹھے گی، بہت خوش وخرم جس طرح بیماری سے پہلے تھے۔ میں آپ سے پیار کی بھیک مانگتا ہوں کہ آپ اس کی لاش یہاں سے نہ لے جایئے۔ ڈاکٹر نے شدتِ جذبات سے بے تاب ہو کر انسپکٹر کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ڈاکٹر کی التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ڈاکٹر کو گرفتار کر کے پولیس اسٹیشن بھیج دیا گیا اور لاش کو شناختی مردہ خانے میں۔

''ڈاکٹر نے اپنے بیان میں بتایا کہ ''غم کے ہاتھوں نڈھال ہو کر اس نے ایسا طریقہ تلاش کیا کہ ایلنا ہمیشہ اس کے گھر میں رہ سکے''۔

''تم نے لاش کس طرح گھر پہنچائی، انسپکٹر نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ ایک رات اس نے قبر کھودی اور کفن سمیت لاش ایک ٹیکسی میں رکھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نیند میں اونگھ رہا تھا۔ اس نے کچھ بھی محسوس نہ کیا، وہ لاش اس نے ہسپتال میں پڑے ہوئے ہوائی جہاز میں رکھی اور ہوائی جہاز کو اس ٹیکسی سے کھنچواتا ہوا اپنے گھر لے گیا۔

اس نے اپنے عجیب وغریب نظریئے پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ موت دراصل ایک عارضی غنودگی کا نام ہے اور انسان اس پر قابو پا سکتا ہے۔ اس لئے میں ایک ایسی دوا بنانے میں مصروف تھا جو موت کی اس غنودگی کو دور کر کے انسان کو جگا

دے۔

ڈاکٹر پر مقدمہ چلا گیا اور طبی معائنے کے بعد اسے پاگل قرار دے دیا گیا، معائنہ کرنے والے ڈاکٹر نے رپورٹ میں لکھا تھا کہ ملزم دان کوزل درحقیقت اس نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے جس میں مریض مردے سے پیار کرتا ہے۔

ڈاکٹر کو رہا کر دیا گیا۔ ایلنا کی حنوط شدہ لاش کو کسی نامعلوم قبر میں دفن کر دیا گیا۔ ڈاکٹر کی ویسٹ چھوڑ کر ڈیفائر ہلز (فلوریڈا) میں سکونت پذیر ہو گیا اور گمنامی کی زندگی گزارتے ہوئے ۱۰ جون ۱۹۵۲ء کو اپنی محبوبہ کی روح سے جا ملا۔

☆☆☆

کھوپڑیاں

(مقبول جہانگیر)

دو گھنٹے بعد ہمیں جنگی نقارے کی آواز سنائی دی جو آنگا رک گیا اور اپنے ساتھیوں سے تیز تیز باتیں کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی۔ جیسے نقارے نے اس کے جذبات پر تھاپ دے دی ہو۔ میں بھی پیٹ پر ہاتھ دھرے کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ اِدھر اُدھر پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ جنگ کا اعلان ہوگیا ہے۔ اس بار جیواریو کے باسیوں سے زور آزمائی کا ارادہ تھا۔ میرے جی میں آئی کہیں سے سلیمانی ٹوپی ہاتھ آ جائے اور میں لہو کے پیاسے ان وحشیوں سے پلک جھپکتے میں دور نکل جاؤں۔

قدرت کی ستم ظریفی سمجھئے یا میرے مقدر کا کرشمہ، میں ہزاروں صعوبتیں برداشت کر کے پیرو کے اس علاقے میں محض اس لئے آیا تھا کہ ان قبیلوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں اور معلوم کروں کہ کس طرح یہ لوگ انسانی کھوپڑی کو سکیڑ کر ننھی سی بنا لیتے ہیں اور تعجب کی بات یہ ہے کہ نہ مقتول کا چہرہ مسخ ہوتا ہے، نہ بال جھڑتے ہیں اور نہ وقت گزرنے کے ساتھ کھوپڑی خراب ہوتی ہے۔ مجھے اس فن کی جستجو اتنی دور کھینچ لائی تھی، مگر اب جب کہ جنگ کا نقارہ بج رہا تھا تو میرا جی چاہنے لگا کہیں سے راہ پا کر بھاگ نکلوں۔

جو آنگا نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پیرو جی اور ہمارے قبیلے میں ہمیشہ صلح رہی ہے۔ پورب کی طرف ہمارے سردار آساپی کا دشمن رہتا ہے۔ مورونا ندی کے کنارے ان کی بستی آباد ہے۔ بڑا کمینہ دشمن ہے۔ ہم نے کئی دفعہ اپنے بھالے زمین میں دبا کر عہد کیا کہ مورونا ندی کی طرف کبھی نہیں جائیں گے۔ لیکن کیا کیا جائے، کمینے اور ذلیل لوگوں سے لڑنا ہی پڑتا ہے"

جوآنگا نے مجھے دلاسا دینے کی بڑی کوشش کی، لیکن جنگ کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہر گھر سے جنگجو بہادر نکل نکل کر آ رہے تھے۔ جب وہ بھالے، رستے اور چاقو لے کر بستی کے چوک میں جمع ہو گئے تو میں بھی دبکتا ہوا اپنی جھونپڑی سے باہر آ گیا قبیلے کی عورتیں اور مرد میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں جوآنگا کے قریب کھڑا ہو گیا۔ موت کو اتنا قریب منڈلاتے دیکھ کر مجھ میں دلیری پیدا ہو گئی۔ جوآنگا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر قبیلے کے لوگوں سے کہا۔

''بھائیو، تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو اس پر بھی اعتماد کرو اور جو اس پر وار کرنا چاہے، اسے پہلے بھالا میرے سینے کے پار کرنا ہو گا۔ تاکہ میں محسن کش نہ کہلاؤں''

جیواریو کی بستی میں پچیس جوان مشتعل، ہراساں اور جنگ کے نشے میں بدمست دوڑے پھر رہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سب نشے میں دھت تھے جنگ سے پہلے یہاں کا دستور ہے کہ بہادر جنگ جو گھڑوں شراب پیتے ہیں، اور سپہ سالار کا طریقہ ہے کہ وہ اتنی مقدار میں شراب ڈکار جاتا ہے کہ اسے دنیا و مافیہا کی خبر تک نہیں رہتی پھر اس پر روحوں کا نزول ہوتا ہے۔ جن کی وجہ سے اسے علم ہو جاتا ہے کہ جیت کس کی ہو گی۔

نشے میں دھت مختلف رنگوں سے لتھڑے ہوئے جسموں پر طرح طرح کے نقش و نگار بنائے گئے۔ بہادر اس بات کا چرچا کر رہے تھے کہ جیت ان کی ہو گی فتح مندی کے نعرے ابھی سے گونجنے لگے تھے۔ میں ان دنوں پیٹ کی خرابی کے باعث بڑا کمزور ہو گیا تھا۔ جنگ کا اعلان ہوا تو جوآنگا میرے پاس ایک کٹورا لے کر آیا۔ اس میں سے نہایت خوشبودار بھاپ نکل رہی تھی۔ میں نے جی میں سوچا کہ موت سے بچنا تو ناممکن ہے۔ کیوں نہ یہ کٹورہ حلق میں انڈیل کر ایک دوست کو خوش کرتا جاؤں، چنانچہ میں نے جوآنگا کے ہاتھ سے کٹورہ لے لیا اور ایک ایک گھونٹ

پینے لگا۔ اسے پیتے ہوئے مجھے نفیس ترین چینی چائے کا سا مزہ آیا۔ میں حیران تھا کہ اس دوا کو پیتے ہی پیٹ کی تکلیف فوراً رفع ہوگئی اور پھر کبھی مجھے اس بیماری سے سابقہ نہ پڑا۔

وہ رات عجیب مصیبت میں گزری، جھونپڑی کے قریب عورتیں اور بچے شور مچاتے، رزمیہ گیت گاتے اور چیختے چلاتے گزر رہے تھے۔ آدھی رات کو جب شور ناقابل برداشت ہوگیا اور طبل کی آواز بہت بلند ہوگئی تو میں جھونپڑی سے نکلا، باہر کھلے میدان میں دور دیہ جنگ پر جانے والے بہادر جمع ہو رہے تھے۔ ان کے رزمیہ گیتوں میں تیکھا پن اور خون کی پیاس جھلک رہی تھی۔ میرا خون رگوں میں جمنے لگا میں نے جو آنگا سے ان گیتوں کا مطلب پوچھا۔ اسے بہت جلدی تھی، مگر پھر بھی اس نے تھوڑی سی سوجھ بوجھ پیدا کر ہی دی اس نے بتایا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی تعریف کر رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے، میں اس طرح وار کروں گا۔ دوسرا بتا رہا ہے کہ میں یوں دشمن کو قتل کروں گا...... کس طرح اس کی کھوپڑی کو سکیڑ کر اپنے آنگن کی زینت بناؤں گا۔

یہ قبائلی لوگ ''سنجی ماچی'' نامی شراب پیتے ہیں جسے یہ خود ہی بناتے، مقطر کرتے اور گھڑوں میں ڈال کر رکھ لیتے ہیں۔ کچھ تو نجی ماچی کا اثر تھا اور کچھ رزمیہ گیتوں نے ان کے خون میں آگ لگا رکھی تھی۔ ہر شخص سوچ رہا تھا کہ پڑوسی دشمن کا ایک سر لائے تو دیوتاؤں کی مہربانی سے وہ تین کھوپڑیاں حاصل کرے۔ چنانچہ ہر سُو ہیجان برپا تھا اور جیواریوں کے در و دیوار تک خون کے پیاسے نظر آ رہے تھے۔

میں جھونپڑی کے سامنے ہی ایک چبوترے پر بیٹھ گیا میں بھی ان گیتوں سے ہمت اور دلیری مستعار لینا چاہتا تھا۔ لیکن ان کی نعرے اس قدر تند، تیز اور جوشیلے تھے کہ بار بار مجھے جھرجھری سی آجاتی اور میں خدا سے دعا مانگنے لگتا کہ مجھے ان وحشیوں کی نگاہوں میں سبکسار ہونے سے بچالے۔

میری نظریں آساپی پر جم گئیں۔ وہ اس قبیلے کا سردار تھا اور اس کی آنکھیں نجی ماچی کے باعث آگ کی مانند دہک رہی تھیں۔ میں کتنی دیر سوچتا رہا کہ نشے کی اس حالت میں بھلا یہ آدمی کیوں کر بہادروں کو لے کر دشمن کا مقابلہ کر سکے گا؟ تاہم مجھے جلد ہی جوآنگا کی زبانی پتہ چل گیا کہ ابھی دشمن اور ان کے درمیان پورے تین دن کا سفر حائل ہے۔ جب اتنی مسافت طے کر کے وہ دشمن کے علاقے میں پہنچیں گے تو شراب کا سارا نشہ ہرن ہو چکا ہوگا۔ میں نے اس جنگ کی وجہ پوچھی، لیکن وہ کوئی خاص وجہ نہ بتا سکا۔ وجہ ہوتی تو بتاتا بہت دیر کے بعد مجھے پتہ چلا کہ ان قبائلی جنگوں کا کبھی کوئی دیرپا نتیجہ نہیں نکلتا۔ سوائے اس کے کہ دشمن کی کتنی کھوپڑیاں ہاتھ آتی ہیں اور مال غنیمت کے طور پر غنیم کی کتنی جواں عورتیں ہنکا کر لائی جاتی ہیں۔

گجردم کوچ کا نقارہ بجا اور بہادر جنگ جو دھارے پر روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے اس وقت میں نے دیکھا کہ بارہ عورتیں بھی ساتھ چلنے کے لئے تیار تھیں۔ انہوں نے کمر سے کھجور کی ٹوکریاں باندھ رکھی تھیں جن میں "نجی ماچی" اور خورد ونوش کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ چار نوعمر لڑکے بھی اپنی رضا سے جنگ میں شریک ہونے کے لئے جا رہے تھے۔

طبل کی آواز جوں جوں بلند ہوتی گئی، مرد، عورتیں اور بچے گھروں سے نکلنے لگے سب سے آخر میں آساپی نکلا۔ اس کے آتے ہی بستی پر ہر سو موت کا سا سناٹا چھا گیا۔ آخری جھونپڑی کے باہر چارپائی پر ایک نہایت ضعیف العمر آدمی بیٹھا سر ہلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر محسوس ہوتا تھا، جیسے وہ ان دنوں کو یاد کر رہا ہے۔ جب وہ بھی ایسی جنگوں میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا کرتا تھا۔

پورے تین دن سفر میں کٹے، گھاٹیاں، ندیاں، پہاڑ اور وادیاں میلوں میں پھیلی ہوئی تھیں، اس علاقے میں جنگل کی کیفیت یہ تھی کہ دن کو بھی شب کا سماں رہتا

تھا۔ تیسری رات خدا خدا کر کے ہم دشمن کی بستی کے قریب جا پہنچے۔ اس علاقے میں غنیم نے جا بجا خفیہ پھندے گاڑ رکھے تھے۔ ہم ان پھندوں سے بچتے بچاتے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ پھر یک دم ایک طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جوآ نگا نے میرے کان میں کہا، دیکھو، دشمن جان گیا ہے کہ ہم گھات میں ہیں، اب حواس قائم رکھنا"

دشمن کی بستی میں بھی اب رزمیہ گیت گونج رہے تھے۔ ان کے لڑاکا جوان ناچنے، گانے اور طبل بجانے لگے۔ ان کے لبوں پر آساپی اور اس کے ساتھیوں کے لئے بد دعائیں تھیں اور ادھر سے بھی بد دعاؤں کا جواب جوشیلے نعروں میں دیا جا رہا تھا۔ بستی کے قریب پہنچ کر تمام بہادر آساپی کے اشارے پر کمین گاہوں میں جا چھپے۔ ان کے پاس جو دو چار بندوقیں تھیں۔ انہیں بے تحاشا داغا جا رہا تھا۔ دشمن نے بھی جواب میں گولیاں برسائیں، مگر جنگل نے کسی کا بس نہ چلنے دیا اور فریقین میں سے کسی کا نقصان نہ ہوا۔ اگر آساپی چاہتا تو اس بستی کا محاصرہ کئے رہتا۔ رفتہ رفتہ ان کے کھانے پینے کی چیزیں ختم ہو جاتیں اور دشمن بھوک پیاس کے ہاتھوں لاچار ہو کر خود بخود ہتھیار ڈال دیتا۔ لیکن آتش کے پرکالے جذباتی لوگوں میں جب ایک بار جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو پھر صبر کی حد سے نکل کر ہر چیز کو بھسم کرنے پر تل جاتی ہے۔ چنانچہ آساپی اپنی فطرت سے مجبور تھا اور اسے اسی وقت حملہ کرنا تھا، جب اس کے بہادروں کی زبان پر فتح مندی کے گیت تھے اور ان کے دماغ میں دشمن کی کھوپڑیاں سکیڑنے کا سودا سمایا ہوا تھا۔

صبح کاذب کے وقت دشمن کے اکھاڑے سے فلک بوس نعرے بلند ہوئے۔ شور کا یہ عالم تھا کہ سارا جنگل گونج رہا تھا۔ گولیاں بھی ہماری جانب برسنے لگیں۔ آساپی نے حکم دیا کہ سپاہی پیچھے کی طرف ہٹ جائیں تاکہ دشمن انہیں کسی طرح گزند نہ پہنچا سکے۔ پیچھے ہٹتے وقت بہادروں کے پیر چیتے کی سی سبک رفتاری

اور گولی کی سی تیزی لئے ہوئے تھے۔ پیچھے ہٹتے ہٹتے ہم وہاں پہنچ گئے جہاں عورتیں جمع تھیں۔ یہ گھر جو جلدی سے کھچیوں، بانس کے ڈنڈوں اور لکڑی کے تختوں سے بنایا گیا تھا، جنگل میں ایسی جگہ چھپا ہوا تھا جسے ڈھونڈنے کے لئے روشنی کرنی پڑی۔

یہاں سے مخبر نکلے اور دشمن کی بستی کی طرف چلے۔ جب وہ چھپتے چھپاتے بستی کے ایک مکان کے قریب پہنچے تو صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ مکان کے اندر سے رہ رہ کر آتی ہوئی آوازوں سے انہیں اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوئی کہ دراصل اس مکان کی حیثیت اس بستی کے ہیڈ کوارٹر کی تھی۔ اس وقت بستی کے بیشتر لوگ اس مکان میں جمع ہو کر صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ مخبروں نے یہ دیکھ کر کہ اس وقت دشمن کے مرکز پر حملہ کرنا سود مند ثابت ہو سکتا ہے، اپنے سردار کو اطلاع دی۔ آساپی نے بہادروں کو صورتِ حال سمجھائی اور انہوں نے پوری شدت سے اس مکان پر حملہ کر دیا اور اس سے پیشتر کہ دشمن سنبھل سکے، ہمارے جنگ جو مکان کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہو چکے تھے۔

دُو بدُو قسم کی جنگ میں بندوقیں کام نہیں دیتیں، چنانچہ دونوں طرف کے بہادر نوکیلے بھالوں اور تیز پھل والے چاقوؤں سے کام لیتے نعرے لگاتے، چیختے، چلاتے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے، جو آنگا کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے میں ایک درخت پر بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ اگر دشمن کے کسی بہادر نے مجھے دیکھ لیا تو میری خیر نہیں۔ آساپی کے نعروں میں خوشی اور کامرانی کی گرج تھی۔ دشمن کی بستی میں کل گیارہ جوان تھے جو سر دھڑ کی بازی لگائے لڑ رہے تھے۔ جنگ کا ایسا ہولناک اور عریاں منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ انسان انسان کا اس قدر دشمن ہے اور انسان میں خون کی پیاس اس حد تک بھی ہو سکتی ہے، اس کا احساس اور اندازہ مجھے یہیں ہوا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر سارا قصہ ختم ہو گیا اور آساپی کے انیس بہادر فتح

مندی کے نشے میں سرشار ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اس کے بعد لاشوں کی جانچ پڑتال شروع ہوئی۔ دشمن کے تین آدمی راہِ فرار اختیار کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ اپنے آدمیوں میں سے پانچ کی لاشیں شناخت ہوئیں۔ ان کے سر نہ اتارے گئے۔ جب کہ دشمن کے تمام جوانوں کے سر دھڑ سے الگ کر لئے گئے ...... یہ اس جنگ کا سب سے مہنگا معاوضہ تھا۔ اس کام سے فارغ ہوکر قیدی عورتوں کا جائزہ لیا گیا۔ جواں سال عورتیں مالِ غنیمت تھیں۔ لہٰذا انہیں ہنکا کر مویشیوں کی طرح آگے دھکیل دیا گیا، کٹے ہوئے سر فاتح بہادروں کے لئے قابلِ فخر تمغوں سے کم نہ تھے۔ اب کھجور کی ڈالیاں لے کر پتے اتار دیئے گئے یہ باریک شاخیں کٹے ہوئے سروں کے منہ سے نکال کر گردن کے چھید میں پرو دی گئیں۔

اب خاموشی سے ادھر ادھر دیکھ کر ہم نے واپسی کا قصد کیا۔ ہمیں ہر لمحہ اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں دشمن نئی کمک لے کر گھات میں نہ بیٹھا ہو، پھونک پھونک کر قدم دھرتے ہم اس جگہ پہنچے، جہاں ہماری عورتیں دبکی بیٹھی تھیں۔ پورا ایک دن ہم کہیں رکے بغیر اپنی بستی کی طرف چلتے رہے۔ ہر لحمہ غنیم کے حملہ کا خدشہ تھا۔ اس کے علاوہ دوسری مصیبت یہ تھی کہ جنگل اتنا گھنا تھا کہ سوائے آساپی اور جوآنگا کے کوئی شخص راہ سے واقف نہ تھا اس لئے عافیت اسی میں سمجھی گئی کہ جتنی جلدی ہوسکے ،دشمن کے علاقے سے دور نکل چلیں۔

دوسرے دن ایک ندی کے کنارے جہاں دُور دُور تک ریت پر چھوٹے

چھوٹے گول پتھر بکھرے ہوئے تھے، ہم نے کیمپ لگایا عورتیں فوراً ہی کھانے پینے کی چیزیں تیار کرنے میں جت گئیں اور مرد ''تسانتساس'' (کھوپڑیاں سکھانے اور سکیڑنے) کے کام میں مشغول ہوگئے۔ میں اساپی کے پاس ریت پر بیٹھ گیا۔ کیوں کہ مجھے پتہ چلا تھا کہ وہ اس فن کا سب سے بڑا ماہر ہے۔ آساپی نے بندر کی کھال

کے بٹوے میں سے بانس کی ایک چھری نکالی اور دشمن کی کھوپڑی کو اپنے زانوں پر ٹکالیا۔ یہ دشمن کے جادو ٹونے کے ماہر عامل کا سر تھا۔ یہ عامل اپنی زندگی میں قبیلے کے بزرگوں اور دیوی دیوتاؤں کی روحوں کو بلا کر اپنی برادری کے تمام دکھوں کا علاج کیا کرتا تھا۔ آساپی نے بانس کی چھری سے بڑی احتیاط کے ساتھ سر کی جلد کو گدی کی جانب سے کاٹ کر عین درمیان تک پہنچانے کے بعد، اسی عمل سے چہرے کی جلد پلٹ دی۔ بالکل اسی طرح جیسے تکیے کا غلاف پلٹا جاتا ہے، جب چہرے کی جلد الٹ چکی تو اس نے اندر کی طرف سے پلکیں دھاگے سے سی کر دوبارہ منہ پر کھال چڑھا دی۔ اب منہ کو بند کرنے کے لئے اس نے اپنا بٹوہ نکالا۔ اس میں سے مضبوط لکڑی کی بنی ہوئی تین چھوٹی چھوٹی کھچیاں نکالیں ان پر اس نے کسی درخت کی چھال سے حاصل کیا ہوا سن کے ریشہ سے مشابہ دھاگہ ساچڑھانے کے بعد کھچیوں سے منہ بند کر دیا اور اوپر سے وہ ریشہ لپیٹ دیا۔ تاکہ پھر نہ کھل سکے۔ پھر اس نے برتن میں ندی سے پانی لیا اور برتن کو پانی سمیت آگ پر چڑھا دیا۔ جب پانی کھولنے لگا تو اس نے کھوکھلی ہڈی سے بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی بوتل میں سے عرق کے چند قطرے پانی میں ٹپکا دیئے میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ یہ کسی جنگلی بیل کا پانی تھا۔ اس کے چند قطرے پانی میں ملانے سے کچھ ایسی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر بالوں والی کھوپڑی اس پانی میں ڈال دی جائے تو اس کے بال کبھی نہیں جھڑتے۔

پانی میں چند قطرے ڈالنے کے فوراً بعد اساپی نے کھوپڑی کو بالوں سے پکڑ کر برتن میں ڈال دیا۔ کھوپڑی کو تو اس نے پانی میں پکنے کے لئے چھوڑا اور خود مجھے ساتھ لے کر پتھروں کی تلاش میں چل پڑا۔ کام کے پتھر تلاش کرنا کچھ آسان نہ تھا۔ کیونکہ قبیلے کے باقی جوان بھی اس قسم کے پتھروں کی تلاش میں تھے۔ اس کام کے لئے ساتھ آئے ہوئے نوعمر لڑکے بہت کارآمد ثابت ہوئے۔ چونکہ وہ اپنے

سردار کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد ہمیں ایسے گول اور شفاف پتھر جمع کر دیئے جن کی آساپی کو ضرورت تھی۔

ان پتھروں کو آساپی نے آگ میں دبا دیا تاکہ وہ خوب تپ جائیں۔ پھر اس نے بالوں سے پکڑ کر کھوپڑی باہر نکالی، جسے دیکھ کر مارے تعجب کے میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ کھوپڑی پہلے سے بہت چھوٹی ہوگئی تھی۔ لیکن اس پر اگے ہوئے بال جوں کے توں اپنی جگہ پر موجود تھے۔ قریباً دو گھنٹے تک کھولتے ہوئے پانی میں پک پک کر کھوپڑی پہلے سے ایک تہائی رہ گئی۔ آساپی اس کو پکڑ کر ہوا میں ادھر اُدھر جھٹکنے لگا، تاکہ خشک ہو جائے اور اس کے اندر جو پانی چلا گیا ہے وہ بھی خارج ہو جائے، اس وقت کھوپڑی کے نقوش بڑی حد تک مسخ ہو چکے تھے اور جلد کی رنگت گہری زرد پڑ چکی تھی۔ جب میں نے یہ بات آساپی کو بتائی تو اس نے ہنس کر جواب دیا۔ تم دیکھتے جاؤ۔ ابھی صورت بھی اصلی ہو جائے گی اور رنگت بھی لوٹ آئے گی"

کھوپڑی کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس نے اس جگہ کئی چھید کر دیے، جہاں سے پہلے اس نے چیرا تھا، اب اس نے آگ میں سے ایک ایسا گول پتھر ڈھونڈ کر باہر نکالا جو تپ کر سرخ ہو گیا تھا۔ اسے ایک چمٹے سے اٹھا کر کھوپڑی کے گلے میں پھنسایا اور آہستہ آہستہ اسے آگے دھکیلنے لگا، جیسے ہی پتھر سر کی جانب گیا، کھوپڑی میں سے سُوں سُوں کی آواز اور گوشت جلنے کی بُو آنے لگی اور اندر سے بھاپ نکلی۔ آساپی نے کھوپڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر زور زور سے ہلایا تو پتھر کھوپڑی میں بجنے لگا...... میں نے پوچھا۔ اس کا فائدہ۔

اگر اس کے اندر گوشت باقی ہوا تو جل جائے گا اور کھوپڑی کبھی خراب نہیں ہو گی۔ آساپی نے جواب دیا۔

جب سڑنے کی بو کچھ کم ہوئی تو اس نے پتھر کو ہولے ہولے باہر نکالا اور

اس مرتبہ پہلے سے بھی چھوٹا پتھر اندر داخل کر دیا، کیونکہ اب سر کا حجم پہلے سے بھی بہت کم رہ گیا تھا۔ خوب اچھی طرح سے تسلی کرنے پر کہ کھوپڑی کے اندر گوشت کی آلائش ختم ہو گئی ہو گی۔ آساپی نے ایک ٹھنڈا گول پتھر لیا اور چہرے کے تمام نقوش جو جلنے کی وجہ سے بری طرح مسخ ہو چکے تھے۔ اسی پتھر کی مدد سے ایک چابک دست مجسمہ ساز کی مانند درست کرنا شروع کئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہی ناک جو لمحہ بھر پہلے چہرے کے ساتھ مل چکی تھی، اب اپنے صحیح مقام پر ابھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔

اس کے بعد آساپی نے گرم گرم ریت لے کر کھوپڑی کے اندر ڈالی۔ اس عمل سے کھوپڑی اور بھی سکڑ گئی اور گوشت کا شائبہ بھی نہ رہا، اب سردار نے اپنا بھالا زمین میں گاڑا، آگ بجھائی اور دھوئیں کے اوپر اس سر کو بھالے سے لٹکا دیا۔ عین کھوپڑی کے اوپر ایک چھید کیا گیا اور اس میں سے درخت کی چھال پرو کر اس کا سرا گلے کے سوراخ میں سے نکالا اور اس کو بھالے سے باندھ دیا۔ اب وہ کھوپڑی بھالے سے بندھی ڈھال کی مانند لٹکتی نظر آ رہی تھی یا اس شیلڈ کی طرح، جسے کھلاڑی جیت کر لائے ہوں اور اسے نمائش کے لئے ایک لکڑی سے لٹکا دیا ہو۔

اس کام سے فارغ ہو کر آساپی نہایت خاموشی سے زمین پر لیٹ گیا، جیسے لہو کی پیاس بجھ گئی ہو اور اب وہ آنکھیں بند کئے سوچ رہا ہو کہ آخر اس سارے ہنگامے، قتل و غارت اور تباہی و بربادی کا فائدہ...... اس ساری محنت کا حاصل؟

میں نے سنا ہے کہ اس قسم کی جنگوں سے زندہ واپس آنے پر جنگ جو سورما کئی مہینے برت رکھتے ہیں پھر مسلسل تین چار روز تک سارا قبیلہ شاندار جشن مناتا ہے اور پھر...... پھر کسی دوسرے قبیلے سے جنگ کی تیاری ہونے لگتی ہے۔ لیکن میرے لئے یہی ایک جنگ کافی تھی۔ اس لئے میں نے کسی سے اجازت لینی بھی ضروری نہ سمجھی اور میں اسی رات کو وہاں سے بھاگ نکلا، کیونکہ مجھے اپنی کھوپڑی بہت عزیز

تھی۔

☆☆☆

قاتل کون تھا

(مقبول جہانگیر)

یہ ۳۱ اگست ۱۸۸۸ء کی ایک سرد اور تاریک رات کا ذکر ہے۔ لندن گہری کہر کے کفن میں لپٹا ہوا موت کی نیند سو رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے گھڑیال نے اپنی بھیانک آواز میں تین بجائے تھے۔ وائٹ چیپل کے علاقے میں یہ کہر کچھ زیادہ ہی شدید تھی۔ سنسان تنگ گلیوں میں جا بجا گیس سے جلنے والے ہنڈوں کی روشنی ہر لمحہ دم توڑ رہی تھی۔ ایک ہیبت ناک سناٹا ہر طرف مسلط تھا۔ مکانوں کے دروازے سختی سے بند تھے کھڑکیوں میں سے روشنی کی کوئی کرن باہر جھانکتی نظر نہ آتی تھی، البتہ کئی اونچے مکانوں کی سالخوردہ چمنیوں سے ہلکا ہلکا دُھواں ضرور خارج ہو رہا تھا۔ جو اس بات کی خبر دیتا تھا کہ ان مکانوں کے اندر آتش دانوں اور باورچی خانوں میں ابھی تک آگ بھڑک رہی ہے۔

یہ لندن کا بدنام ترین حصہ ایسٹ اینڈ تھا۔ نچلے طبقے کے لوگوں کی گھنی اور گندی آبادی جس میں اسّی ہزار طوائفیں بھی اپنا گھناؤنا کاروبار کرتی تھیں۔ ایسٹ اینڈ...... جہاں سے شریف آدمی کا صحیح سلامت گزر جانا محال تھا۔ گھٹیا شراب خانوں جوئے بازی کے اڈوں اور پراسرار اڈوں اور غنڈوں کی آماجگاہ۔ یہ اسی ایسٹ اینڈ کی ایک تاریک اور سرد رات تھی۔ جو آج بھی تقریباً اسی برس گزر جانے کے بعد لندن والوں کو یاد ہے۔

شراب خانے رات کا بیشتر حصہ بیت جانے کے باعث بند ہو چکے تھے۔

نشے میں بدمست اور بیحال گاہک گرتے پڑتے اور ایک دوسرے کو فحش گالیاں بکتے اپنے اپنے ٹھکانوں کو جاچکے تھے، لیکن ریڈ گوز کے شراب خانے میں سے ابھی تک

قہقہوں اور باتوں کا شور ابل رہا تھا۔ آوازیں عورتوں کی تھیں۔ جسم فروخت کرنے والی عورتیں...... بے حیا اور شراب کی رسیا طوائفیں جن کے جسموں سے گندے پیپ بھرے پھوڑوں کی بو اٹھتی، ریڈ گوز کے تاریک اور سیلے ہوئے لکڑی کے فرش اور جابجا پڑی ہوئی بوسیدہ کرسیوں اور بنچوں پر لیٹی، بیٹھی آپس میں چہلیں کر رہی تھیں، یہ روز کا معمول تھا اور اس میں کبھی فرق نہ آتا۔

ریڈ گوز کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی تاریک اور کسی قدر محفوظ گوشے میں ایک شخص اپنے گھٹنے پیٹ سے لگائے اور سڑا ہوا کمبل اوڑھے اطمینان کی نیند سو رہا تھا۔ بے چارہ مداری تھا دن بھر مختلف گلیوں اور بازاروں میں بندر کا تماشا دکھا کر لوگوں سے پیسے بٹورتا اور شام کو آ کر یہ ساری رقم شراب اور جوئے کی نذر کر دیتا۔ اس کا پالتو بندر قریب ہی بیٹھا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بندر نے دائیں ہاتھ میں ٹین کا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھام رکھا تھا۔ مداری نے اپنے بندر کو بھیک مانگنے کی عادت خوب سکھائی، جب مداری شراب کے نشے میں مست ہو کر فراٹے بھرنے لگتا، تو بندر اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتا۔ ریڈ گوز کے دروازے سے نکلنے والی طوائفیں اور بدمعاش جونہی بندر کو نظر آتے، وہ نہایت عاجزی سے ٹین کا ڈبا آگے بڑھا دیتا اور کوئی نہ کوئی اس کے ڈبے میں چھوٹا سا سکہ ڈال دیتا۔ اس رات بھی بندر امید بھری نظروں سے ریڈ گوز کے دروازے کو گھور رہا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ شراب کا ایک پوا

خریدنے کے لئے اس کے ٹین میں کتنے سکے ہونے چاہیں۔ مداری نے اپنی طرح اسے بھی شراب کا عادی کر دیا، لیکن مصیبت یہ تھی کہ بندر کو اپنی شراب کے لئے پیسے بھی خود ہی جمع کرنے پڑتے، جونہی اس کا ڈبا سکوں سے خاصا وزنی ہو جاتا، وہ خوشی سے اچھلتا کودتا شراب خانے میں گھس جاتا۔ شراب خانے کا مالک کاؤنٹر پر کام کرنے والا بارمین اور سارے شرابی بندر کو جانتے پہچانتے تھے۔ بندر عادت کے

مطابق کاؤنٹر پر ڈبا اُلٹ دیتا، سکے چھن چھن کرکے باہر گرتے، بارمین انہیں گن کر صندوقچی میں ڈالتا۔ الماری میں سے ایک چھوٹی بوتل نکال کر بندر کو تھما دیتا، ، بندر وہیں بیٹھے بیٹھے اسے منہ سے لگاتا اور خالی کر کے چل دیتا۔

یکا یک ریڈ گوز کا دروازہ دھماکے سے کھلا، روشنی کی چند کرنیں دروازہ کھلتے ہی آزاد اور کہر کا سینہ چیر کر دُور تک پھیل جانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ پھر کسی شخص نے گالی دے کر دروازہ بند کیا۔ بندر مستعد ہو کر بیٹھ گیا شراب خانے سے نکلنے والی ایک دبلی پتلی ادھیڑ عمر کی طوائف تھی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ عالم سرمستی میں اپنے آپ سے اٹھکیلیاں کرتی اور اپنی بھدی آواز میں کوئی بے ہودہ گانا گاتی سیدھی اس طرف آئی جدھر مداری پڑا سوتا تھا۔ بندر دوڑ کر اس کے نزدیک گیا اور خوشامدانہ انداز میں ٹین کا ڈبا آگے بڑھا کر خوخیانے لگا۔

''چل حرامزادے...... بدمعاش...... طوائف نے خوش دلی سے بندر کو گالیاں دے کر اپنا پرس بغل سے نکال کر ہاتھ میں لیا۔ الو کا پٹھا...... روز پیسے مانگتا ہے جیسے اس کے باپ کا مال ہے...... اس نے ایک سکہ ڈبے میں ڈال دیا اور آگے بڑھی۔ ایک لخت اس کا پیر سوئے ہوئے مداری سے ٹکرا گیا۔ عورت گرتے گرتے بچی

اور پھر اس کے منہ سے شرمناک گالیوں کا بے پناہ سیلاب اُمڈ پڑا۔ اس نے مداری کے ایک ٹھوکر رسید کی۔ مگر وہ نشے میں دھت بے خبر پڑا تھا۔ اس نے اس ٹھوکر کا کوئی اثر نہ لیا۔

"حرامی کے پلے...... سور...... راستے میں سو جاتے ہیں پڑ کر...... جیسے ان کی ماں...... گالیوں کی رفتار بڑھتی ہی گئی، عورت پر ٹھنڈی ہوا اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اس نے اپنے جسم کے گرد جھولتا ہوا پرانا کوٹ اچھی طرح لپیٹنے کی کوشش کی، مگر ناکام رہی۔ چند لمحے تک ایک اندھی گلی میں ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ کسی قدر اجالے میں پہنچی۔ اب وہ آپ ہی آپ ہنس رہی تھی۔ بے معنی ہنسی...... اس نے محسوس کر لیا تھا کہ قدم لڑکھڑا رہے ہیں، چنانچہ وہ سنبھل سنبھل کر پیر رکھنے لگی۔ اس کا گھر نزدیک آ گیا تھا۔ بس سامنے گلی کا موڑ مڑتے ہی وہ اپنے مکان میں پہنچ جائے گی۔

یکا یک وہ ایک کھمبے سے ٹکرا گئی۔ کھلا ہوا پرس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ سکے بکھرنے کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی۔

"یہ کیا ہوا؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ یہ کم بخت کھمبا ان بدمعاشوں کو یہیں لگانا تھا...... محکمے والوں کی شان میں قصیدہ پڑھنے کا ارادہ ملتوی کر کے وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ اور اندھوں کی طرح سکے ٹٹول ٹٹول کر اپنے پرس میں ڈالنے لگی۔ سکے اٹھانے کے بعد جب وہ اٹھ کر کھڑی ہونے لگی تو اس کی ٹانگوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ سہارا لینے کے بعد اس نے کھمبے کو پکڑ لیا اور ہمت کر کے اٹھنے ہی والی تھی کہ اس کے کانوں میں ایک گہری سرد آواز آئی۔

"میری کلارک؟"

بدنصیب عورت نے نظریں اٹھا کر پکارنے والے کی طرف دیکھا۔ فرطِ خوف سے اس کا کلیجہ تھرا گیا اور نبضیں ڈوبنے لگیں۔ تین قدم کی فاصلے پر سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا ایک طویل قامت شخص کھڑا تھا۔ چمکدار، سرخ آنکھوں کے سوا جسم کا کوئی حصّہ کھلا نہ تھا۔ اس کے ہاتھوں پر بھی سیاہ دستانے چڑھے ہوئے تھے جن میں چاندی کی مانند کوئی شے عورت کو چمکتی نظر آتی تھی۔ وہ پتھر کے بے جان بت کی مانند آدھی بیٹھی اور آدھی کھڑی اس شخص کی طرف گھورنے لگی۔

"کیا تم میری کلارک ہو؟"

اس مرتبہ اجنبی کی آواز میں کچھ ایسا تحکم اور دبدبہ تھا کہ شراب کے نشے میں مدہوش عورت کانپنے لگی۔ اس نے جسم کی پوری قوت جمع کر کے کھمبے کا سہارا لیا اور

اٹھنے کی کوشش کی، مگر اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں اور گردن جھٹکے کھا رہی تھی۔ اس نے خوف دور کرنے کی بھی سعی کی، لیکن اجنبی کی سرخ چمکدار بھیڑیے جیسی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب وہ دیوار کے ساتھ پشت لگائے لرز رہی تھی، اجنبی اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا تھا، اس کے ہونٹ پھر کھلے اور اس مرتبہ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بولو، کیا تم ہی میری کلارک ہو؟"

طوائف مسکرائی، وہ سمجھ گئی کوئی گاہک ہے، لیکن بے وقت آیا ہے۔ اب وہ کاروباری لہجے میں اس سے بولی۔

''میرا نام میری کلارک نہیں ہے، مگر آؤ میں تمہیں ساتھ لئے چلتی ہوں......

کتنے پیسے ہیں تمہاری جیب میں...... اس کی مسکراہٹ ہنسی میں بدلنے ہی والی تھی کہ اجنبی کے ہاتھوں میں ایک لمبا چمکدار خنجر دیکھ کر سہم گئی۔ وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور اس سے پہلے کے طوائف کے حلق سے چیخ نکلے، اس کا بایاں فولادی پنجہ عورت کے گلے میں گڑ چکا تھا اور دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا خنجر آہستہ آہستہ اس کی شہ رگ کے نزدیک آتا جا رہا تھا۔ عورت کے دانت سختی سے بھنچ گئے اور منہ سے گرم گرم خون کی ایک پتلی سی دھار بہہ نکلی۔ انتہائی تیز دھار والا خنجر اس کی گردن کاٹ چکا تھا۔ خون میں نہائی ہوئی طوائف نے آخری بار اپنے قاتل کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا اور پتلے پتلے بھنچے ہوئے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے طوائف کی روح جسم کے پنجرے سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو گئی۔

واردات کے کچھ دیر بعد گشتی سپاہیوں کی ایک ٹولی ادھر سے گزری تو انہوں نے طوائف کی لاش پڑی پائی، وہ اپنے ہی خون میں نہائی ہوئی تھی، گردن دھڑ سے تقریباً علیحدہ ہو چکی تھی، پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں ادھر ادھر بکھری ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا قتل کرنے کے بعد قاتل نے ایک قصاب کی طرح اپنا خنجر لاش سے آزمایا ہے اور اس کی بوٹی بوٹی الگ کرنے کی کوشش کی ہے، اس نے دونوں گردے ایک ماہر سرجن کی طرح گویا آپریشن کر کے باہر نکال دیے تھے اور دل چیر کر ایک جانب پھینک دیا تھا۔

قتل کی یہ پہلی واردات تھی جو جیک دی ریپر نے ایسٹ اینڈ کے علاقے میں

کی اور پھر دو ماہ کے اندر یکے بعد دیگرے مزید چار طوائفیں اس بھیانک اور وحشیانہ انداز میں موت کے گھاٹ اتار دی گئیں۔ اس دوران میں قاتل کو کسی شخص نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، پولیس کی سرتوڑ کوشش کے باوجود وہ گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ اور آج تک یہ معمہ لاینحل ہے کہ ایسٹ اینڈ کے علاقے میں ادھیڑ عمر کی پانچ طوائفوں کو قتل کر کے ان کی لاشوں کے بخیے ادھیڑنے والا کون شخص تھا۔ اس کے بارے میں بے شمار کہانیاں مشہور ہوئیں۔ اور لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیں، مگر جیک دی ریپر کا کوئی سراغ نہیں ملا کہ آخر یہ شخص کہاں سے آیا؟ اس کا حلیہ کیا تھا؟ وہ طوائفوں کو قتل کیوں کرتا تھا؟ ایسی وارداتوں کے پیچھے اصل مقصد کیا تھا اور آخر کار غائب کہاں ہو گیا؟ اس پراسرار قاتل نے جو بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور جرائم کی دنیا میں ایک ریکارڈ قائم کیا، اس کی داستان پولیس کی رپورٹوں اور اس زمانے کے بعض مستند لوگوں کے بیانات اور تحقیق کی روشنی میں پیش کی جا رہی ہے۔

جیک دی ریپر کا نام لندن کے لوگ کبھی نہ بھول سکیں گے۔ خصوصاً ایسٹ اینڈ میں رہنے والوں کے سامنے آج بھی اس کا ذکر کیا جائے، تو کئی عورتیں دہشت سے کانپتی ہیں اور بعض تو ہم پرست لوگ اپنے سینوں پر صلیب کا نشان بار بار بناتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جیک دی ریپر کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھی جو ایسٹ اینڈ کی طوائفوں کو راہ راست پر لانے کے لئے خدا نے بھیجی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں یہ وارداتیں ہوئیں، ایسٹ اینڈ کے علاقے میں جتنی بے حیائی اور بدکاری ہوتی تھی، اتنی غالباً پوری دنیا میں مجموعی طور پر کہیں بھی

نہ ہوتی ہوگی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ عنقریب کوئی آفت آنے والی ہے اور پھر اس علاقے کی طوائفوں پر جیک دی رپر کی صورت میں کہر خداوندی ٹوٹ پڑا۔ ۳۱ اگست ۱۸۸۸ء سے ۹ نومبر ۱۸۸۸ء تک کے درمیانی عرصے میں پانچ طوائفیں اس کے خون آشام خنجر کا شکار ہوئیں اور پورے لندن میں دہشت، سراسیمگی، افراتفری اور ابتری پھیل گئی، طوائفیں یہ علاقہ خالی کر کے جانے لگیں، بازار اور دکانیں سرشام ہی بند ہو جاتے، کوئی شخص اور خصوصاً طوائفیں سورج غروب ہونے کے بعد گھر سے باہر نکلنے کی جرت نہ کرتیں۔ جیک دی رپر بھیانک بھوت بن کران کے ہوش و ہواس پر چھا چکا تھا۔ ایسا بھوت جسے پکڑنے کے لئے پولیس والوں کی راتوں کی نیندیں اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ اخباروں نے مقالے، مضامین اور خبریں چھاپ چھاپ کر عوام کو مزید دہلا دیا تھا۔ ہر فرد و بشر اپنے سائے سے بھی بدکنے لگا۔ جیک دی رپر...... جیک دی رپر...... جدھر جاؤ، جدھر سنو، اس کی باتیں، اسی کا تذکرہ...... لیکن تعجب یہ کہ کسی ایک شخص نے بھی اس طویل مدت میں جیک دی رپر کو نہیں دیکھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آدمی تھا یا مجسم شیطان، پانچ طوائفوں کی لاشیں جس حالت میں پائی گئیں۔ انہیں دیکھ کر نڈر سے نڈر آدمی کا پتہ پانی ہوتا تھا۔ شہ رگ کاٹنے کے بعد وہ دوسرا وار لاش کے پیٹ پر کرتا اور پیٹ ادھیڑ کر نہ صرف آنتیں باہر نکال دیتا۔ بلکہ گردے اور کلیجہ بھی ایک ماہر سرجن کی طرح آپریشن کر کے الگ الگ کر ڈالتا۔

ماہرین سرجری کا خیال تھا کہ یہ کام کسی جنونی سرجن کا ہے جو پاگل خانے سے کسی نہ کسی طرح بھاگ آیا ہے، اور اب عورتوں پر اپنے خنجر کی دھار آزما رہا ہے۔

ماہرین نفسیات کہتے تھے کہ یہ شخص کسی وجہ سے طوائفوں کا جانی دشمن ہے،

ضرور اسے ان عورتوں کی کسی حرکت کے باعث تکلیف پہنچی ہے، ممکن ہے اس کی دیوانگی میں کسی طوائف کا ہاتھ ہو اور اب ان سے انتقام لے رہا ہو۔ غرضیکہ جتنے منہ اتنی باتیں یہ معمہ روزِ اول کی طرح آج بھی حل طلب ہے۔ کہ جیک دی رپر کون تھا، کہاں سے آیا اور کہاں غائب ہو گیا۔

اس کا نام جیک دی رپر کیسے پڑا؟ یہ کہانی بڑی دلچسپ ہے، انہی دنوں معلوم ہوا کہ لندن کی سینٹرل نیوز ایجنسی کو ایک پوسٹ کارڈ ملا جس پر ۲۵ ستمبر ۱۸۸۸ء کی مہر لگی تھی۔ اس خط کے آخر میں جیک دی رپر کے دستخط تھے کہا جاتا ہے کہ یہ خط قاتل نے اپنے قلم سے تحریر کیا۔ جیک اس کا اصل نام تھا یا نہیں اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔ چونکہ پورے لندن میں یہ قاتل جیک کے فرضی نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس لئے ممکن ہے قاتل نے یہی نام کارڈ پر بھی لکھ دیا ہو اور دی رپر Ther Ripper اسے یوں کہا گیا کہ وہ لاشوں کا تیا پانچا کر ڈالتا تھا، چنانچہ اس کا پورا نام جیک دی رپر مشہور ہو گیا۔ بہر حال پوسٹ کارڈ لندن کے سبھی اخباروں میں شائع ہوا اور پولیس نے بھی پوسٹروں کی صورت میں اس کا مضمون چھاپا اور عوام سے اپیل کی کہ جو شخص اس خط کے لکھنے والے کا پتہ نشان بتلائے گا اسے بھاری انعام دیا جائے گا، لیکن بے سود......

خط لکھنے کی وجہ یہ تھی کہ تفتیش و تحقیق کے دوران میں پولیس نے بے شمار لوگوں کو جیک دی رپر کی شبے میں گرفتار کیا تھا۔ ان میں اکثر ڈاکٹر تھے اور بعض پیشہ ور قاتل اور لٹیرے، بلکہ ایک مرتبہ تو ایک ایسے شخص پر پولیس کو جیک دی رپر ہونے کا

پورا یقین ہوگیا جو واقعی اپنی چال ڈھال اور حرکتوں سے نہایت پر اسرار اور قاتل نظر آتا تھا۔ اور یہ شخص اتفاق سے سرجن بھی رہ چکا تھا، چنانچہ جیک دی رپر کی گرفتاری عمل میں لائی گئی۔ لیکن اگلے ہی روز یہ پوسٹ کارڈ خبر رساں ایجنسی کے ''باس'' کو مل گیا جس میں جیک دی رپر نے دعوی کیا تھا کہ پولیس نے اب تک جتنے لوگوں کو اس کے شبہے میں گرفتار کیا ہے، وہ سب بے گناہ ہیں اور وہ اصل جیک دی رپر پر کبھی ہاتھ نہیں ڈال سکتی وغیرہ وغیرہ اس خط سے مزید سنسنی اور دہشت پھیلی۔

جیسا کہ بتایا گیا، قاتل نے اپنا پہلا شکار ۳۱ اگست ۱۸۸۸ء کو رات کے تین بجے کیا عورت کا پورا نام میری این نکولس اور عمر ۴۲ سال۔ اس عورت میں کوئی خاص بات نہ تھی اور وہ بھی لندن کی اسی ہزار طوائفوں میں سے ایک تھی جو ایسٹ اینڈ کے علاقے میں رہ کر اپنا گھناؤنا کاروبار کر رہی تھیں۔ طوائفوں کے پاس ہر قسم کے لوگ آتے رہتے تھے اور پولیس کو تحقیقات کے دوران میں پتہ نہیں چل سکا اور نہ چل سکتا تھا کہ جیک دی رپر سے میری نکوس کی کیا دشمنی تھی اور اس نے اس عورت کو خاص طور پر اپنے خنجر کا سزاوار کیوں سمجھا اور پھر مزید چار طوائفوں کو کس لیے قتل کیا۔

اس بھید پر آج تک پردہ پڑا ہوا ہے۔ لے دے کر یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ اپنی خون آشام اور بہیمانہ فطرت کو تسکین کے لئے یہ حرکت کرتا تھا اور یہ محض اتفاق کی بات ہے کہ جو شکار اس کے سامنے آتا رہا، وہ سب کی سب طوائفیں تھیں اس کی ایک معقول وجہ یہ بھی ہے کہ ایسٹ اینڈ کا علاقہ نہایت گنجان اور تنگ تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد شراب خانوں اور جوئے بازی کے اڈوں پر خوب رونق ہوتی۔ گلیاں کثرتاً تاریک ہوتیں جن کے مختلف گوشوں اور ناکوں پر طوائفیں بنی

سنوری گاہکوں کی تلاش میں پھرتی رہتی تھیں۔ یہ سلسلہ سورج نکلنے تک جاری رہتا تھا اور اسی لئے جیک دی ریپر کو اپنا شکار ڈھونڈنے میں کوئی خاص دشواری پیش نہ آتی تھی۔

واردات کے تھوڑی دیر بعد میری نکولس کی لاش دیکھ لی گئی تھی، اس وقت اس کا جسم گرم تھا حیرت تھی کہ اس نے اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش نہ کی۔ اگر وہ ایک مرتبہ بلند آواز سے مدد کے لئے پکار ہی دیتی تو قریب ہی سوئے ہوئے لوگ یقیناً جاگ پڑتے اور ریڈ گوز کا شراب خانہ تو نزدیک ہی تھا۔ ان دنوں وائٹ چیپل کی گلیوں اور محلوں میں آوارہ اور بیکار قسم کے لوگ کثرت سے سویا کرتے تھے۔ وہ لازماً میری نکولس کو بچانے کی کوشس کرتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاتل کی پر اسرار اور غیر معمولی شخصیت نے شراب کے نشے میں مدہوش طوائف کے اوسان خطا کر دیئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسے کوئی گاہک ہی سمجھی ہو، پھر اس نے ایک کان سے دوسرے کان تک گردن اچھی طرح کاٹ ڈالی۔ اس کے بعد اطمینان سے عورت کا پیٹ چاک کیا اور ایک تجربہ کار ماہر سرجن کی طرح پوسٹ مارٹم مکمل کیا۔ لاش کا معائنہ کرنے سے اندازہ ہوا کہ اس نے جس اوزار سے چیر پھاڑ کی، وہ انتہائی تیز اور لمبے پھل کا چاقو یا خنجر تھا۔

ابھی پولیس کی تحقیق و تفتیش ابتدائی مراحل میں تھی اور اخباروں میں پر اسرار اور نامعلوم وحشی قاتل کا چرچا ہو ہی رہا تھا کہ ایک دوسری واردات منظر عام پر آ گئی اور اس مرتبہ جیک دی ریپر کے تیز خنجر کی دھار کا مزا ۴۷ سالہ اینی چاپ مین نامی طوائف نے چکھا۔ وہ بھی ایسٹ اینڈ کی رہنے والی اور پرلے درجے کی شرابی اور بدکار عورت تھی۔ اس کی ادھڑی اور نچی ہوئی خون میں لت پت لاش ۸ ستمبر کی صبح ۶

بجے کے قریب ہان بری اسٹریٹ میں پڑی پائی گئی۔لاش کو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ یہ وحشیانہ حرکت بھی اسی قاتل کی ہے جس نے میری نکولس کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔فرق صرف اتنا تھا کہ جیک دی رپر نے میری نکولس کی گردن دھڑ کے ساتھ لگی رہنے دی تھی، لیکن چاپ مین کی گردن بالکل الگ کر کے ایک بڑے سے رومال میں لپیٹ کر ایک گوشے میں پھینک دی تھی۔

ہان بری اسٹریٹ رات کے وقت مکمل تاریکی میں ڈوبی رہتی تھی اور یہاں جیک دی رپر کو بڑے اطمینان سے لاش پر سرجری کے جوہر دکھانے کا موقع مل گیا۔ اس نے نہایت صفائی سے پیٹ چاک کیا۔آنتیں نکالیں، دونوں گردے الگ کیے، پھر سینہ چیر کر دل بھی نکال لیا اور ان اعضا کو لاش کے چاروں طرف سجا کر غائب ہوگیا۔اس نے اپنے پیچھے ایسا کوئی نشان نہیں چھوڑا جس سے یہ سراغ لگ سکتا ہو کہ واردات کے بعد وہ کس طرف گیا۔اندھیرے میں لاش کا پوسٹ مارٹم کرنا کچھ آسان نہ تھا۔اس لئے قیاس ہے کہ اس کے پاس روشنی کا کوئی نہ کوئی انتظام تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کون ایسا نڈر اور جیالہ قاتل ہوگا جو لالٹین جلا کر ایک گھنی آبادی والے علاقے میں لاش کو چیرنے پھاڑنے کی جرات کرے گا۔مزید یہ کہ جس جگہ وہ قتل کرتا پوسٹ مارٹم بھی وہیں ہوتا۔وہ لاش کو گھسیٹ کر کسی محفوظ مقام پر لے جانے کی زحمت بھی گوارا نہ کرتا تھا۔لاش کے پاس جو چیزیں پڑی پائی گئیں، وہ تھیں چند سکے، پیتل کی دو انگوٹھیاں، ایک خون آلود لفافہ اور چمڑے کا ایپرن۔ کچھ پتہ نہیں چل سکا یہ چیزیں قاتل کی تھیں یا مقتول کی۔ڈاکٹروں نے طوائف کی لاش کا جب معائنہ کیا تو بھی متفقہ فیصلہ کیا کہ قاتل اعلیٰ درجے کا سرجن ہے، کیونکہ اس نے جس

صفائی سے گردے الگ کئے تھے، انتڑیاں نکالی تھیں اور دل چیرا تھا وہ ظاہر کرتی تھی کہ اسے اس کام میں مہارت حاصل ہے۔

تحقیقات مرگ کی عدالت میں جب شہادتیں پیش ہوئیں اور پراسرار قاتل کی شخصیت کے بارے میں بحث شروع ہوئی تو کارونر نے کھلے الفاظ میں جیک دی ریپر کو خراج تحسین پیش کیا اور کہا۔

''قاتل اگرچہ ہماری نظروں سے غائب ہے اور دونوں وارداتوں کا بلاشبہ

وہی ذمے دار ہے، لیکن اس کی ہوشیاری، ذہانت اور پُرسکون طبیعت کی داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے یہ بھیانک جرائم جس انداز میں کئے ہیں، وہ نہ صرف پولیس، بلکہ پورے معاشرے کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے، ماہرین طب کی رائے یہ ہے کہ قاتل وادات کرنے کے بعد لاش کو جس طرح چیرتا پھاڑتا ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ فنِ سرجری سے گہری واقفیت رکھتا ہے۔

دوسری واردات نے لندن میں جیسے آگ لگا دی۔ لوگ اپنے اپنے کام دھندے بھول گئے اور اب ہر طرف جیک دی ریپر ہی کا ذکر تھا، طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں۔ اخباروں نے اس قصے کو جس انداز میں پیش کیا، وہ نہایت سنسنی خیز اور گڑبڑ پھیلنے کا سبب بنا۔ بعض نڈر اور منچلے قسم کے نوجوان اور دوسرے لوگ جیک دی ریپر کو پکڑنے کے لئے تازی کتوں کی مانند گلی گلی اور کوچے کوچے سونگھتے پھر رہے تھے۔ پولیس کا ناطقہ بند تھا۔ سکاٹ لینڈ کی پوری مشینری دن رات اس نامعلوم قاتل کا سراغ لگانے کے لئے سرگرم عمل تھی، مگر بے سود...... روزانہ بے

شمار غنڈے اور بدمعاش شہر کے مختلف کونوں کھدروں سے پکڑ پکڑ کر تھانوں میں لائے جاتے اور گھنٹوں پوچھ گچھ کرنے کے بعد چھوڑ دیئے جاتے، ان میں سے کوئی بھی جیک دی ریپر نہ تھا۔

اب انتظار یہ تھا کہ قاتل تیسری واردات کب اور کہاں کرے گا۔

ستمبر کا مہینہ آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ جیک دی ریپر اپنی کمین گاہ میں اطمینان سے بیٹھا رہا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایسٹ اینڈ کے علاقے سے نکل کر کسی اور جانب چلا گیا ہے۔ اور یہ خیال درست ثابت ہوا۔ انہی دنوں یعنی ۲۸ ستمبر کو سنٹرل نیوز ایجنسی کے ایڈیٹر کے نام گلاسگو سے ایک پوسٹ کارڈ موصول ہوا جس پر جیک دی ریپر کے دستخط تھے اور اس میں اس نے دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا۔

''میں عارضی طور پر ذرا ستانے کے لئے یہاں آ گیا ہوں۔ عنقریب پھر ''کھیل کے میدان'' میں حاضر ہوں گا''۔

کھیل کے میدان سے اس کی مراد غالباً لندن سے تھی۔ اس خط کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں لکھائی اتنی عجیب اور مہمل سی تھی کہ آج بھی اس کا پورا مطلب کوئی نہیں بوجھ سکا۔ اس کے علاوہ عبارت پر جا بجا سیاہ دھبے بھی پڑے ہوئے تھے۔ اس خط کا شائع ہونا تھا کہ لندن ایک نئی سراسیمگی سے دوچار ہو گیا۔ لوگ اب بے چینی سے جیک دی ریپر کی واپسی کے منتظر تھے اور طوائفوں میں تو جیسی کھلبلی مچی وہ بیان سے باہر ہے۔ لوگوں کو تیسری واردات کا کچھ زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ اگلے ہی روز یعنی ۲۹ ستمبر کی درمیانی شب کو جیک دی ریپر نے ایسٹ اینڈ ہی کے علاقے میں دو طوائفوں کو اپنے خنجر بُراں سے ذبح کیا۔ یعنی ایک ہی رات میں قتل کی دو

وارداتیں۔ پہلی کا نام الزبتھ تھا اور عمر ۵۴ سال۔ اپنے غیر معمولی لمبے قد کی وجہ سے یہ عورت ''لمبی الزبتھ'' کے نام سے ایسٹ اینڈ میں بدنام تھی۔ شراب کے نشے میں چوبیس گھنٹے غرق رہتی اور جب ہوش آتا، تو دوسری طوائفوں کو مارتی پیٹتی اور انہیں گالیاں دیتی۔ اس کا خاوند ایک سوکھا سا دبلا پتلا بڑھئی تھا۔ کبھی کبھار یہ عورت اس کی بھی مرمت کر دیتی۔ ایسٹ اینڈ کے اکثر لوگ اس کے ہاتھوں پریشان اور نالاں تھے۔ اس کی لاش برنر سٹریٹ میں پڑی پائی گئی اور دریافت کرنے والا ایک ہاکر تھا جو منہ اندھیرے اپنی گھوڑا گاڑی پر آتا اور اخبار تقسیم کرتا تھا۔ اس رات چونکہ جیک دی رپر کا خط اخباروں میں چھپا تھا اور خاص ایڈیشن شائع ہوئے تھے۔ اس لئے وہ صبح کاذب سے بھی کچھ دیر پہلے اخبارات کے بنڈل گاڑی پر لاد کر نکل آیا۔ اس کا بیان ہے۔

''جب میں برنر سٹریٹ میں داخل ہوا، تو میں نے ایک عورت کی لاش سڑک کے درمیان پڑی پائی۔ اس کی گردن کٹی ہوئی تھی اور خون اُبل اُبل کر اُس کے کپڑوں اور فرش پر جمع ہو رہا تھا۔ میں نے شور مچا کر لوگوں کو جمع کر لیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ''لمبی الزبتھ'' ہے جو جیک دی رپر کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس کی جان نکل چکی تھی، مگر جسم ابھی تک سرد نہیں پڑا تھا۔

''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ اس کا جسم سرد نہیں پڑا تھا؟ سکاٹ لینڈ یارڈ کے انسپکٹر اونیل نے پوچھا۔

''جناب، میں نے اسے چھو کر دیکھا تھا۔ ہاکر نے گھبرا کر جواب دیا۔ مگر خدا کے لئے مجھ پر شک نہ کیجیے...... میں جیک دی رپر نہیں ہوں...... میں قسم کھاتا

ہوں...... آپ جس سے جی چاہے میرے بارے میں پوچھ سکتے ہیں...... میں جیک دی ریپر نہیں ہوں۔

''اچھا، اچھا۔ انسپکٹر نے اس بکواس سے تنگ آ کر کہا۔

''میں نے کب کہا ہے کہ تم ہی جیک دی ریپر ہو...... میں تو تم سے صرف ضابطے کی پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ اب غور کر کے بتاؤ کہ تم نے واردات سے پہلے یا بعد میں کسی مشتبہ آدمی کو تو اس علاقے میں گھومتے پھرتے نہیں دیکھا؟

ہاکر چند لمحے سوچتا رہا، پھر کہنے لگا۔

''میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ انسپکٹر، برنرز سٹریٹ میں جب میری گھوڑا گاڑی داخل ہوئی تو سنگین فرش پر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اس قدر گونج رہی تھی کہ میں نے کوئی آواز اس کے علاوہ نہیں سنی اور وہاں ایسا گھپ اندھیرا تھا کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا''

''پھر تم نے لمبی الزبتھ کی لاش کیسے دیکھ لی؟ انسپکٹر نے جرح کی۔

''وہ یوں کہ جس جگہ لاش پڑی تھی، اس کے قریب ہی ایک مکان کی ڈیوڑھی تھی۔ مجھے اس شخص سے اس روز بل کا تقاضا بھی کرنا تھا، چنانچہ میں نے گاڑی روک کر دروازے پر دستک دی، چند منٹ بعد اس شخص نے اپنے گھر میں بتی جلائی اور اس کی روشنی شیشوں سے چھن کر باہر گلی میں آنے لگی اور پھر میں نے اسے دیکھ لیا......

''کسے؟ انسپکٹر نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ جیک دی ریپر کو؟

''نہیں انسپکٹر، لاش کو۔ ہاکر نے ہنس کر جواب دیا اور انسپکٹر اونیل منہ بنا کر

رہ گیا۔۔

لاش کی حالت اور مختلف لوگوں کے بیانات کی روشنی میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ یہ کام بھی جیک دی رپر کا ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہوا کہ اس مرتبہ اس نے لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا تھا۔ غالباً اسے وقت ہی نہیں مل سکا اور عین اس لمحے جبکہ اس کا خنجر لمبی الزبتھ کا پیٹ چاک کرنے والا تھا، ہاکر اپنی گھوڑا گاڑی لئے برنزسٹریٹ میں داخل ہوا۔ اب قاتل کے لئے وہاں ٹھہرنا ممکن نہ رہا، چنانچہ وہ رفو چکر ہوگیا، لیکن اس کی پیاس ابھی تک بجھی نہ تھی اور انسانی گوشت کو چیرنے پھاڑنے کا جو بھوت اس کی سر پر سوار تھا، اسے اتارنے کے لئے ضروری تھا کہ ایک اور شکار مارا جائے، چنانچہ برنزاسٹریٹ سے بھاگنے کے بعد وہ سیدھا مائٹر سکوئر کی طرف گیا، اسے معلوم تھا کہ وہاں دو تین شراب خانے بھی رات رات بھر کھلے رہتے ہیں اور کوئی نہ کوئی بھولی بھٹکی طوائف نظر آ جائے گی۔ ایسٹ اینڈ میں جب سے قتل کی یہ بھیانک وارداتیں شروع ہوئی تھیں۔ طوائفوں نے رات کو زیادہ دیر تک گھر سے باہر رہنے کی عادتیں ترک کردی تھیں۔ اور ان کا کاروبار خاصا مندا پڑ گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سی سرپھری عورتیں ایسی تھیں جنہیں جیک دی رپر اور اس کے کارناموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اب بھی اندھیری راتوں میں گاہکوں کو تلاش کرتی پھرتیں یا شراب خانوں میں پناہ لیتی تھیں۔ ۴۳ سالہ کیتھرائن ایڈوز بھی انہی میں سے ایک تھی، مگر وہ جیک دی رپر کے جس طرح قابو میں آئی اسے محض اتفاق یا کیتھرائن کی بدنصیبی ہی کہا جاسکتا ہے۔

قصہ یہ ہوا کہ اس عورت کو پولیس نے ۲۷ ستمبر کے دن ایسٹ اینڈ کے علاقے میں غل غپاڑہ مچانے اور چند معزز اور شریف آدمیوں کو گالیاں دینے کے

الزام میں گرفتار کیا اور چونکہ اس عورت نے مجسٹریٹ کو بھی عدالت میں برا بھلا کہا۔ اس لئے اسے دو دن اور دو راتیں حوالات میں قید رکھنے کی سزا دی گئی۔ ۲۹ اور ۳۰ ستمبر کی درمیانی رات کو تقریباً پونے چار بجے کے لگ بھگ اسے بشپ گیٹ کے پولیس اسٹیشن کی حوالات سے رہا کیا گیا۔ پولیس والے جانتے تھے کہ یہ عورت ایسٹ اینڈ کی طوائف ہے، اگر اسے رات کی تاریکی میں رہا کیا گیا تو فوراً وہیں جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ جیک دی ریپر کے ہتھے چڑھ جائے، لیکن انہوں نے محض ضابطہ پورا کرنے کے لئے کیتھرائن کو آزاد کر دیا اور کہا کہ فوراً اپنے گھر چلی جائے۔ حالانکہ وہ اسے صبح کے وقت بھی چھوڑ سکتے تھے۔ رہا ہونے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد گشت کرنے والے ایک سپاہی نے کیتھرائن کی خون میں لت پت لاش مائٹر سکوائر میں پڑی پائی۔ قاتل نے نہ صرف اس کی گردن اڑا دی تھی، بلکہ پیٹ اور سینہ چاک کر کی انتڑیاں، گردے کلیجی اور دل تک باہر نکال لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے پوسٹ مارٹم کرنے کی پوری پوری آزادی مل گئی تھی اور اس سنسان علاقے میں اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ بعد میں ایک پولیس افسر نے بیان دیتے ہوئے کہا۔

”ہمیں کیتھرائن کو پونے چار بجے اس لئے چھوڑنا پڑا کہ اس کی قید کا وقت پورا ہو چکا تھا اگر ہم اسے اس کے بعد بھی روکے رکھتے تو حبس بے جا کا مقدمہ دائر کیا جا سکتا تھا۔

عوام میں پولیس کے اس رویئے سے سخت اشتعال پھیل گیا اور اخباروں نے انسانی ہمدردی کے نام پر ایسی دہائی دی کہ پارلیمنٹ میں بھی یہ موضوع زیر بحث

آیا۔ اور اس پر خاصی لے دے ہوئی۔ دو طوائفوں کا ایک ہی رات میں اس بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جانا لندن کے لوگوں کی نیندیں حرام کر دینے کے لئے کافی تھا۔ ہر طرف شور مچ گیا کہ حکومت عوام کی جان بچانے کے فرائض سے غافل ہو گئی ہے۔ اور قاتل دندناتا پھرتا ہے۔ آج وہ ایسٹ اینڈ کو اپنی خوں آشام سرگرمیوں کا مرکز بنائے ہوئے ہے، کل لندن کے دوسرے محلوں کی باری بھی آ جائے گی۔ ادھر پولیس کا یہ حال تھا کہ جیک دی رپر کی تلاش میں دن رات ایک کئے ہوئے تھی۔ مگر نہ معلوم وہ شخص چھلاوہ تھا یا کیا۔ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ طوائفوں سے اسے کیا عداوت ہے اور واردات کرنے کے بعد غائب کہاں ہو جاتا ہے۔ مجرموں اور بدمعاشوں کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ کیونکہ ان میں سے ہر شخص اس بات سے ڈرتا تھا کہ اسے جیک دی رپر نہ سمجھ لیا جائے، لیکن بعض جی دار بدمعاش ایسے بھی تھے جو اس پر اسرار اور انتہائی سفاک قاتل کے کارناموں کا کریڈٹ خود لینے کے لئے تیار تھے۔ غالباً سستی شہرت پانے کے لئے...... چنانچہ کئی بدمعاشوں اور پیشہ ور قاتلوں نے تفتیش کے دوران میں پولیس کے سامنے اقرار کیا کہ وہی جیک دی رپر ہیں، اور پھر تو ایسا فیشن ہوا کہ پولیس کو پریشان کرنے کے لئے معمولی سے معمولی بدمعاش بھی فون کر دیتا اور کہتا۔

"میں جیک دی رپر بول رہا ہوں، فلاں جگہ بیٹھا ہوں، آؤ اور مجھے پکڑ لو"۔

پولیس فوراً اس پتے پر پہنچتی اور فون کرنے والے کو گرفتار کر لیتی، اس زمانے میں ٹیلی فون اتنے عام نہیں تھے اور چند برس پہلے ہی لندن کے سرکاری دفتروں، ڈاک خانوں، اور ریلوے اسٹیشنوں اور بعض اہم پبلک مقامات پر ٹیلی فون لگائے

گئے تھے، اس لئے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ فون کہاں سے کیا گیا ہے اور کرنے والا کون ہے۔ گرفتار ہونے کے بعد اس شخص کی داستانیں اخباروں میں چھپتیں اور لوگ انتہائی دلچسپی سے ان کے مقدموں اور تفتیش کے واقعات پڑھتے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوتا کہ پکڑا جانے والا شخص جیک دی ریپر نہیں تھا اور اس نے محض اپنی مشہوری کے لئے یہ چکر چلایا تھا۔ اس طرح پولیس اتنی بدنام ہوئی کہ بالآخر میٹرو پولیٹن پولیس کے کمشنر کو استعفے دینا پڑا۔

چار طوائفیں قتل ہو چکی تھیں اور اب پانچویں کی باری تھی۔ ایسٹ اینڈ کے علاقے میں چپے چپے پر پولیس کے خفیہ جوان بکھرے ہوئے تھے۔ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ایک ایک گلی اور ایک ایک بازار کی نگرانی کی جارہی تھی، ان محلوں اور کوچوں میں جہاں گیس لائٹ کا انتظام نہیں تھا، روشنی کا فوری بندوبست کیا گیا کیونکہ تاریکی جیک دی ریپر کو اپنے گھناؤنے افعال پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بڑی مدد دیتی تھی۔

پانچ ہفتے گزر گئے، کوئی واردات نہ ہوئی، اس دوران میں جیک دی ریپر لندن اور خصوصاً ایسٹ اینڈ میں رہنے والے لوگوں کے حواس پر بری طرح چھایا رہا اور چونکہ اسکا وار ہمیشہ کسی نہ کسی طوائف پر ہوتا تھا، اس لئے سب سے زیادہ دہشت اور سراسیمگی اسی طبقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ بے شمار طوائفیں اپنے اپنے اڈے چھوڑ کر برطانیہ کے دور دراز علاقوں میں جارہی تھیں۔

نومبر کی ۹ تاریخ تھی اور صبح کے آٹھ بجے تھے، اور ملرز کورٹ کے محلے میں ایک شخص کرایہ لینے کے لئے ایک طوائف کے مکان پر پہنچا۔ یہاں ۲۵ سالہ میری

کیلے رہتے تھی۔ نہایت شوخ اور چالاک اور ایسٹ اینڈ کی تمام طوائفوں میں اپنی زیادہ آمدنی کے باعث حسد و رشک کی نظروں سے دیکھی جاتی تھی۔ مالک مکان دیر تک دروازہ کھٹکھٹاتا رہا، لیکن میری نے دروازہ نہ کھولا۔ تب اس کی نگاہ دائیں کھڑکی

پر پڑی جس کا ایک پٹ کھلا ہوا تھا۔ یہ کھڑکی خواب گاہ کی تھی۔ مالک مکان نے کھڑکی میں سے جھانکا اور پھر وہ اپنی چیخ نہ روک سکا۔

میری کیلے اپنے بستر پر اس حال میں مری پڑی تھی کہ اس کا جسم مادر زاد برہنہ تھا گردن ایک کان سے دوسری کان تک کٹی ہوئی تھی اور چاک شدہ پیٹ پر خون کے بڑے بڑے لوتھڑے جمے ہوئے تھے۔ قریب ہی ایک چھوٹی میز پر بدنصیب عورت کی کٹی ہوئی چھاتیاں، دونوں گردے اور دل میز پر دھرا تھا۔ قاتل نے انتڑیاں پائینتی کی جانب پھیلا دی تھیں۔ پولیس کو اس کا لباس نہایت احتیاط سے لپٹا ہوا مسہری کے نیچے ہی پڑا مل گیا۔ قاتل نے میری کی گردن کاٹ کر ہلاک کرنے کے بعد اس کا خون آلود لباس احتیاط سے اتارا اور بنڈل بنا کر مسہری کے نیچے رکھ دیا تھا۔ اس نے میری کی ناک بھی اڑا دی تھی۔

اور یہ اس کا آخری شکار تھا۔ وہ دن اور آج کا دن جیک دی رپر نے پھر کوئی قتل نہیں کیا اور نہ اس کا کوئی سراغ پولیس کو ملا (اگرچہ اس کے بعد بھی لندن میں قتل کی کئی وارداتیں ہوئیں، لیکن لاشوں کو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ کام جیک دی رپر کا نہیں ہو سکتا) البتہ اس کے بارے میں قیاسات کا ایک انبار ہے جو اتنے برسوں سے مسلسل لگایا جا رہا ہے۔

چند قرینِ قیاس باتیں جو جیک دی رپر کے بارے میں مشہور رہیں۔ وہ یہ

تھیں......

☆ کسی حادثے میں اچانک مارا گیا۔

☆ خودکشی کرلی۔

☆ ملک سے باہر نکل جانے میں کامیاب ہوگیا۔

☆ یا کسی اور جرم میں ماخوذ ہوکر پھانسی کی سزا کو پہنچا۔

☆ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے پکڑ کر پاگل خانے میں داخل کرا دیا گیا ہو۔

اور کسی کو اس کی شخصیت پر جیک دی ریپر ہونے کا شبہ نہ ہوا ہو۔

بہر حال جرائم کی دنیا میں اس سفاک قاتل کا نام سرفہرست ہے جس نے پانچ عورتوں کو بیدردی سے قتل کیا اور روپوش ہوگیا۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا؟ یہ راز سربستہ ہے اور شاید ہمیشہ رہے گا۔

☆☆☆